طسرِ اوّل
(اردو ادب میں ٹیپ بند نظموں کا پہلا اور نمائندہ مجموعہ)
علیم صبا نویدی
مرتب:
حکیم محمد یعقوب اسلم
زیرِ اہتمام:
ڈاکٹر جاویدہ حبیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمسِ اوّل

(اردو ادب میں ٹیپ بند نظموں کا پہلا اور نمائندہ مجموعہ)

☆

علیم صبا نویدی

پیش کش:

نورِ جنوب سہ ماہی، چینائی

کتاب کا نام	:	لمسِ اول
موضوع	:	اردو ٹیپ بند نظمیں
تعداد	:	۷۸۶
سنہ اشاعت	:	جلد اول ۱۹۷۸ء جلد دوم ۲۰۱۲ء
قیمت	:	Rs. 250/-
مطبع	:	ثمل تاڈ وارد و پبلیکیشنز
مصنف	:	علیم صبا نویدی
		266، ٹرپلیکن ہائی روڈ ، چینائی-600 005
مرتب	:	حکیم محمد یعقوب اسلم مرحوم، وانمباڑی (شمالی آرکاٹ)

☆

زیرنگرانی

ڈاکٹر جاویدہ حبیب

۲۶، امیر النساء بیگم اسٹریٹ، چینائی-600 002

☆

Author
Aleem Saba Naveedi
266, Triplicane High Road,
Chennai-600 005.
Cell: 98403 61399

Under Supervision
Dr. Javeeda Habeeb
26/34, Ameerunnisa Begum St.,
Chennai-600 002.
Cell: 98843 37214

فہرست

تاثرات

ڈاکٹر جاویدہ حبیب

حکیم محمد یعقوب اسلم مرحوم کی ادبی مملکت

جانے والے کبھی نہیں آتے   جانے والوں کی یاد آتی ہے

کے مصداق مولانا حکیم یعقوب اسلم نے اردو داں طبقے کے دلوں پر ایک گہرا داغ چھوڑ کر ۲۰ دسمبر کی رات اس فانی دنیا سے رخصت ہوئے اور ۲۱ دسمبر بعد نمازِ عصر بڑی پیٹ وانمباڑی میں مرحوم کی تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم کی نمازِ جنازہ میں تقریباً ڈیڑھ ہزار لوگوں (جس میں آمبور، گڑیاتم، پرنامبٹ، کرشناگری، چینائی اور وانمباڑی کے علماء ادباء اور شعراء کی کثیر تعداد موجود تھی) نے ادا کی۔

علیم صبؔا نویدی نے ۱۹۹۳ء میں ایک ہائیکو نظم میں حکیم یعقوب اسلم کی بود و باش اور ان کے تخلیقی ناقدری کا ذکر یوں کیا تھا۔

دوندیوں کے پار
اپنے فن کے جوہر روشن
روتا ہے فن کار

پھر اچانک موصوف مرحوم کی میت دیکھ کر یوں کہا ہے۔

دوندیوں کے پار
اپنے فن کے جوہر روشن
سوتا ہے فن کار

تاریخی شہادتوں سے اس بات کا علم ہوا کہ جن دوندیاں کے پار جہاں مرحوم کی رہائش گاہ تھی ''پالار'' ندی کی شاخیں ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جس نے اس نظم سے متعلق یہ تاثر دیا تھا۔

''دور پردیس میں فن پارے کی قدر نہیں ہوتی اور گھر میں فن کار بے قدری کا شکار ہو کر نظر انداز کیا جاتا ہے جب باہر والے اس توصیف و تحسین کرتے ہیں۔ اپنوں کی آنکھیں کھولتی ہیں۔'' اسی المیہ کو صبؔا نویدی صاحب نے اپنی ہائیکو میں پیش کیا ہے۔ (مطبوعہ ''روشن لکیر'' ۱۹۹۵ء)

مولوی محمد یعقوب اسلم عمری (فرزند مولوی عبدالغفور مقیم آلانگائم۔ جو وانمباڑی کے مضافات میں پہاڑی سلسلوں میں واقع ایک خوبصورت چھوٹا سا قریہ ہے) کی پیدائش ۱۸ جولائی ۱۹۴۵ء میں آلانگایم میں ہوئی۔ ابتدائی

تعلیم اپنے قریہ ہی کے مدرسہ میں ہوئی اور پھر آپ کو جامعہ دارالسلام عمرآباد میں داخل کرایا گیا۔ جہاں سے انہوں نے مولوی فاضل اور مدراس یونیورسٹی سے ادیب فاضل کیا پھر بی۔ اے۔ کی سند حاصل کی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۷۹ء میں اردو میں یم۔اے۔ کی سند حاصل کی۔ آپ اسلامیہ ہائی اسکول وانمباڑی میں ۱۹۶۷ء میں بطور اردو مدرس (اردو منشی) ملازمت میں شریک ہوئے اسی مدرسہ سے اردو پی جی پوسٹ سے ۲۰۰۴ء میں مستعفی ہوئے۔ جامعہ دارالسلام میں آپ علامہ شاکر نائطی کے خاص شاگردوں میں سے تھے اور ان سے گھریلو مراسم بھی قائم تھے اس لئے یعقوب اسلم میں ایک طرح کی استاد سے محبت دکھائی دیتی ہے اور انہی کی دعاؤں کے نتیجے میں وہ زندگی کے ہر مرحلے میں بہت سبک روی سے گذرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

یعقوب اسلم ہی کی اطلاع کے مطابق انہوں نے ادبی سرگرمیوں کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا۔ یعقوب اسلم میں شریف اور بُردبار شخص ہی ملتا تھا درس وتدریس میں بھی انہوں نے بہت اونچا نام پیدا کیا اور طلبا میں اردو زبان کا درک پیدا کرنے کی خاطر انہوں نے اردو کے گائیڈ زار اور اردو گرامر طبع کرانے کا ایک سلسلہ قائم کر رکھا تھا۔ آج بھی طلباء ان کی لکھی ہوئی کتابوں سے اور جو اساتذہ اردو گرامر سے نابلد تھے وہ بھی مستفیض ہو رہے ہیں۔

یعقوب اسلم سے متعلق علیم صبانویدی یوں رقمطراز ہیں۔

> ''اُن کی تخلیقات میں رندی اور سرشاری کے وہ عناصر ملتے ہیں جن سے ہر شعر میں شراب دوآتشہ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کلام کے مطالعہ سے ان کی غیر معمولی ذہانت اور تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے آج کل ان کی شعری تجلیات میں نئے احساس، نئی فکر اور نت نئے زاویوں کی دھیمی آنچ آسمانوں کی طرف سر اُٹھاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ روایت کی پاس داری نے انہیں ایک زمانے تک اپنی ذات کے خول سے باہر نکلنے نہیں دیا تھا۔ لیکن آج ان کی شاعری کے تیور نئی جلوہ سامانیوں سے آراستہ اور مزین دکھائی دیتے ہیں۔ (مطبوعہ ''تمل ناڈو اردو'' ۱۹۹۸ء)

یعقوب اسلم نے ایک افسانوی مجموعہ چہروں کی دیوار (مطبوعہ ۱۹۸۶ء) دنیائے ادب کے روبرو پیش کیا ہے جس کا مقدمہ علیم صبانویدی نے لکھا ہے ان کے افسانوں سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

> ''یعقوب اسلم کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہر بات کو سیدھے سادے الفاظ میں پیش کیا ہے ان کے اکثر افسانوں میں بے ساختہ پن نمایاں ہے اور یہ بے ساختہ پن کی تکلف یا آورد کا نتیجہ نہیں بلکہ زندگی کی سچائیوں اور حقیقتوں کے عمیق مطالعہ کا نچوڑ ہے۔''

یعقوب اسلم نے نظمیں بھی کہی تھیں اور غزلیں بھی۔ آپ کا ایک مجموعہ نعتیہ کلام پر مبنی ''رسول عربی'' بھی منظرِ عام پر آیا تھا۔ یعقوب اسلم کے غزلوں کا مزاج ذیل کے اشعار میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں سمندر رکھنا — سامنے سب کے شکایت کا نہ دفتر رکھنا

موت سڑکوں پہ کھلے عام پھرا کرتی ہے — اپنا نام اور پتہ جیب میں لکھ کر رکھنا

سر پہ سورج نہ رہا، گھر میں اُجالا نہ رہا — کیا کہا تم نے کوئی چاہنے والا نہ رہا

شب فراق ستارے بجھے بجھے تھے مگر — ہمارے خانہ دل میں ہی امنگ کی دھوپ

آپ کی مندرجہ ذیل نظم میں بھی یہی سادگی اور پرکاری ملتی ہے۔ ایک مختصر سی نظم ملاحظہ کیجئے:

میں اُٹھا اک عہد کی تعمیر کرنے کے لئے

مجھ سے پہلے میری بدنامی اٹھی، رسوا ہوئی

کبھی کبھی یہ چنچل خاموشی بھی

بولنے لگتی ہے

لیکن؟

اس کی زبان پر صرف

تمہارا نام ہوتا ہے۔ (مطبوعہ ماہنامہ ''شمع'' دہلی ۱۹۷۱ء)

یعقوب اسلم مرحوم کی شعری کائنات سے زیادہ خوبصورت نثری تحریروں کا جہان تھا۔ اس جہان کے جو کتابی دستاویز راقمہ کے ہاتھ لگے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱) عبدالغنی - ایک مفکر اور اک مدرس اور رہنما (۱۹۸۳ء)۔ (۲) عکس در عکس (علیم صبانویدی کی فن اور شخصیت کا جائزہ) (۱۹۸۴ء)۔ (۳) دوندیوں کے پار (شعری مجموعہ) (۴) مٹی کی خوشبو (ٹمل ناڈو کے معتبر فنکاروں پر مضامین) (۲۰۱۰ء)

یعقوب اسلم صاحب سے ادبی دنیا کو جو اُمیدیں وابستہ تھیں وہ بڑی روشنی کے دائرے میں پھیل کر اچانک سکڑ کر رہ گئیں۔ لیکن جو روشنی کی کرنیں ناقدین ادب کی ذہنوں میں نقش ہیں وہ اَن مٹ ضرور ہیں۔

مسرت اس بات کی ہے کہ موصوف کی زندگی کے آخری دنوں میں اہل وانمباڑی کو شاید ان کے سربلند ادبی حوصلوں کا احساس ''چراغ اردو'' کی پُرنور کرنوں سے ہوا ہے۔ اور اکبر زاہد نے اس احساسِ قدردانی کا پرچم بلند کیا تو سبوں نے ان کا بھرپور ساتھ دیا اور ۳۱ ردسمبر کی رات ایک عظیم الشان جلسے میں ان کی موت، کے جانسوز المیہ کی تعزیت ادا کرتے ہوئے مرحوم کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں کاکا زبیر اردو ادب ایوارڈ سے سرفراز کیا اور یہ

ایوارڈ مرحوم کے دونوں فرزندوں جاوید اور نصرت سعید نے حاصل کیا۔

قارئین کی اطلاع کے لئے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اسی اجلاس میں حضرت عبدالبیان حمادؔ عمر آباد، حضرت مختار بدری، کرشنا گری اور حضرت علیم صبؔا نویدی (چینائی) ڈاکٹر جلال عرفان (وانمباڑی) ڈاکٹر نثار احمد (وانمباڑی) کو بھی ان کی علمی، ادبی اور تحقیقی خدمات کے اعتراف میں حضرت کا کازبیر (جنوب ہند کے سرسید) ایوارڈ سے نوازا گیا۔

مجھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ چچا محمد حکیم یعقوب اسلم صاحب اپنی وفات سے چار ماہ پہلے راقمہ کے گھر چند گھنٹوں کے لئے تشریف فرما ہوئے تھے۔ دوپہر کے Lunch سے فارغت پانے کے بعد حضرت موصوف نے مجھ سے کہا کہ انہیں ''عکس در عکس'' پر آئے ہوئے ادباء شعراء کے خطوط فوراً درکار ہیں جنھیں وہ ''عکس در عکس'' کے دوسرے ایڈیشن میں ترتیب دینا چاہتے ہیں۔ ابا حضور حضرت علیم صبؔا نویدی نے جب اُن کے آگے ''لمس اول'' کی ترتیب کی بات رکھی تو انہوں نے علیم صبؔا نویدی پر ایک تفصیلی مضمون لکھ کر بھیجنے کا وعدہ کیا اور کہا کہ ''لمس اول'' کی نظموں سے متعلق حضرت راز امتیاز، ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر وحید اختر کے مضامین بے حد وقیع اور جاندار ہیں مزید ان نظموں پر میں روشنی ڈالنا پسند کرونگا۔

حضرت حکیم یعقوب اسلم صاحب نے اپنے وعدے کے مطابق مضمون لکھ بھیجا اور اس اور اس خط میں ''چراغ اردو'' کے لئے فوراً حضرت علیم صبؔا نویدی کا مضمون ''ٹمل ناڈو میں اردو زبان کے ساتھ خاموش دشمنی'' بھیج دینے کی گذارش کی۔ اطلاعاً عرض خدمت ہے کہ حضرت علیم صبؔا نویدی کا مضمون حضرت یعقوب اسلم صاحب نے ''چراغ اردو'' میں شائع تو کر دیا لیکن اس مضمون کی اشاعت کے بعد اک طویل خط علیم صبؔا نویدی نے مرحوم کے نام لکھا تھا جس میں ٹمل ناڈو میں اردو اور اس کی تباہی میں کن کن کا ہاتھ ہے اس کا ذکر خاص طور پر کیا تھا۔ مرحوم نے اس خط کو ''چراغ اردو'' کی آئندہ اشاعت کی چھاپنے کی اطلاع بھی دی تھی۔ کاش یعقوب اسلم صاحب اردو کی آبرو بن کر اور کچھ دن ہمارے درمیان رہتے تو اردو زبان و ادب کا بھلا ہی ہوتا۔ لیکن وقت کو شاید یہ منظور نہیں تھا۔

جاویدہ حبیب

۶ رجنوری ۲۰۱۱ء

☆☆☆

حکیم محمد یعقوب اسلم مرحوم

علیم صبانویدی ایک شاعر، ادیب اور محقق

چینئی ایک پُر ہنگام اور بھاگتا دوڑتا شہر ہے اور جن لوگوں کو بڑے بڑے شہروں کی مصروف آب و ہوا اور تقاضوں سے بھرپور زندگی گزارنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں وقت کا خونِ جگر ہمیشہ ہی ودیعت مژگانِ یار رہوا کرتا ہے جس کے ایک ایک لمحہ کا حساب یقیناً دینا پڑتا ہے لیکن اس چینئی میں ایک شخصیت ہے جو اس شہر سے زیادہ پُر ہنگام اور متحرک ہے اس کی یہ حرکت اور بھاگ دوڑ کسی ذاتی مفاد یا مالی منفعت کی غرض سے نہیں بلکہ اس کا سارا مقصد اردو زبان و ادب کی خدمت اور اس کی سربلندی سے عبارت ہے۔

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ علیم کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوتا ہے یا افسانہ نگاری سے لیکن ان کی پہلی کتاب ''روشنی کے بھنور'' ہے جو ان کے حسن فیاض اور فضل جاوید کے افسانوں پر مشتمل ہے۔ علیم نے ۱۹۵۵ء ہی سے افسانہ نگاری شروع کر دی تھی اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں یعنی لگ بھگ بیس سال کے بعد ''طرح نو'' کی اشاعت عمل میں آئی تھی۔ جو ان کی غزلیات پر مشتمل ہے اس کے بعد گویا دبستان ہی کھل گیا ہے۔ یکے بعد دیگرے ان کے شعری مجموعے مختلف اصناف سخن پر نکلتے گئے اور پھر اچانک ان کی زندگی میں ایک انقلاب آیا اور انہیں محسوس ہونے لگا کہ ٹمل ناڈو کے بے حساب قدیم شعراء ادیب اور علماء گمنامی اور اندھیروں میں گم ہو گئے ہیں اگر ان کے احیا اور ان کی بازیافت کا کام انجام نہیں دیا گیا تو ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ زمانہ نہ صرف ان کے کارناموں کو ہی بلکہ ان کا نام و نشان تک مٹا دے گا۔ اس طرح سے علیم کی تحقیقی تخلیقات کا آغاز ہوتا ہے اور ''جنوب کا شعر و ادب'' کے نام سے ان کی تحقیقی کتاب ۱۹۹۳ء میں منظر عام پر آتی ہے پھر ٹمل ناڈو میں اردو ''ٹمل ناڈو کے صاحب تصنیف علماء'' ''ٹمل ناڈو کے مشاہیر ادب'' ''خواتین ٹمل ناڈو کی دینی، علمی اور ادبی خدمات'' وغیرہ کتابوں کا ایک عظیم سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جس

کے تحت انہوں نے ''ٹمل ناڈو میں اردو'' کے آغاز سے لے کر آج تک کے ہر چھوٹے بڑے فن کار، شاعر، ادیب، افسانہ نگار، صحافی، نقاد، غرض ادب کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے اشخاص وافراد کی بازیافت کی ہے اور بڑی مشکلوں سے ان کے حالات، نمونۂ کلام اور کتابوں کے نام محفوظ کردیئے ہیں۔ ٹمل ناڈو کے ادبیات کا کوئی بھی محقق ان کتابوں سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں علیم کو بہت قریب سے جانتا اور پہچانتا ہوں ان کی ادبی زندگی کے نشیب وفراز آج بھی میرے سامنے ہیں انھوں نے اپنی زندگی کے وہ عزیز ترین لمحات بھی اردو ادب پر نچھاور کردیئے ہیں جس کا اظہار میں نے ''عکس در عکس'' میں کیا ہے۔ ہمارے درمیان ایک ایسا دور بھی گزرا ہے کہ علیم کے ادبی رشتے کی توسط سے علیم کے ابا حضور بھی میرے اچھے دوست بن گئے تھے۔ علیم کی غیر موجودگی میں موصوف مجھے بھی اپنے گھر کا ایک اہم فرد تصور کرتے تھے موصوف کی وسیع النظری اور فراخ دلی کا ذکر بھی یہاں لازمی ہے۔ کہ موصوف بعض اوقات اپنے گھریلو معاملات میں بھی مجھ سے رائے لے لیتے تھے۔

ٹمل ناڈو کے عظیم شاعر وادیب حضرت کاوش بدری ''ٹمل ناڈو میں اردو (مطبوعہ ۱۹۸۹ء) سے متعلق کیا فرماتے ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

> ''ٹمل ناڈو میں اردو'' ایک عظیم تحفہ ہے دو تین بار میں نے اس کا مطالعہ کیا۔ یہ تحقیقی اور ادبی کام آپ (علیم صبؔا نویدی) کو تا قیامت زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ فن کاروں کی دعائیں آپ کے لئے بہت کافی ہیں۔ ٹمل ناڈو کے سر کو علمی، ادبی، شعری اور تحقیقی میدان میں آپ نے بلند کردیا ہے۔''

لوگ حیران ہیں کہ علیم آخر اتنے سارے کام کس طرح انجام دے لیتے ہیں کچھ انہیں حسد کی نظروں سے دیکھتے ہیں لیکن اکثر کو ان پر رشک آتا ہے۔

علیم صبؔا نویدی کی پیدائش ۲۸ فروری ۱۹۴۲ء کو ٹمل ناڈو کے ضلع شمالی آرکاٹ کے ایک قصبہ امور (والا جاہ پیٹ) میں ہوئی۔ ان کے والد سید غوث پاشاہ صاحب حسینی القادری مرحوم ایک سیدھے سادھے اور مرنجان مرنج قسم کے بزرگ تھے۔ ابتدائی تعلیم مدراس کے گورنمنٹ مدرسہ اعظم اسکول میں ہوئی۔ پھر نیو کالج مدراس سے PUC ۱۹۶۱ء میں پاس کیا اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۶۸ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔

علیم کی شادی افسر جہاں سے ہوئی لیکن یہ شادی خانہ آبادی بننے کی بجائے حالات کی ناستواری، معاشی عدم توازن اور ذہنی ناآہنگی کا شکار ہو کر ختم ہوگئی تو اس نے بنگلور کی ایک وفا شعار لڑکی

فریہ بیگم سعیدہ سے دوسری شادی کرلی۔ اس شادی کے نتیجہ میں جاویدہ کا جنم ہوا علیم نے جاویدہ کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔ انہوں نے اردو عربی دونوں زبانوں میں یم اے کیا ہے اور پھر یم۔ فل۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی اور پھر بی۔ یل۔ ای۔ یس۔ کیا اور اب یس آئی ای ٹی کالج چینئی میں اردو کی لکچرر ہیں ان کی شادی محمد حبیب اللہ صاحب (فرزند محمد قدرت اللہ مدنی) سے ہوئی۔ جو چمڑے کے ایک باوقار تاجر ہیں ابھی حال میں دوتین برس پہلے (مارچ ۲۰۰۸ء میں) سعیدہ بھابی بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی علیم نے مشاعروں اور ادبی محفلوں میں شرکت اور شاعروں سے تعلقات بڑھانے کے شوق نے پہلی غزل ۱۹۵۴ء میں کہی تھی جب کہ اس نے عمر کی صرف سولہ منزلیں طئے کی تھیں یہ غزل ایک طرحی مشاعرے کے لئے تھی جس کا مصرع اس طرح تھا ع

عمر رواں کے نقش قدم یاد آ گئے

۱۹۵۹ء میں جب دانش فرازی صاحب آمبور سے مدراس آئے تو مدراس کا منتخب ادبی سرمایہ اٹکنس اسٹریٹ، مریت کالونی بڑی میٹ، مدراس کے ایک چھوٹے سے کمرے میں یکجا ہوگیا تھا۔ جس میں نہ صرف مدراس بلکہ ریاست بھر کے منتخب فن کار جمع ہوا کرتے تھے اور شمالی ہند سے اس کمرے میں حاضری دینے والوں میں نیاز حیدر، فراق گورکھپوری، محمود ایاز، حمید الماس، شفا گوالیاری، رامانند ساگر، سلام مچھلی شہری، پریم وار برٹنی، رضا واہی نقوی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ علیم صبا نویدی کو ان تمام اکابرین علم وادب کی صحبتیں نصیب ہوئیں۔

حضرت دانش فرازی سے پہلے حضرت راحی صدیقی نے علیم کی ذہنی اور فکری نشو ونما کی تعمیر وتشکیل کا کام انجام دیا تھا۔ جن دنوں انہوں نے افسانہ نگاری شروع کی تھی اور راحی صدیقی ان کی کہانیوں کی زبان وبیان کی خامیوں کو دور کردیا کرتے تھے۔

اس طرح ان دونوں حضرات نے علیم کے اندر کے فن کار کو ابھارا اور نکھارا تھا۔ یہ تھیں وہ دو عظیم المرتبت شخصیتیں جنھوں نے براہ راست یا بالواسطہ طور پر علیم کی فکری اور ادبی تربیت میں نمایاں رول انجام دیا تھا۔ علمی کساد بازاری اور ادبی بددیانتی کے اس دور میں جہاں بہت سے شاگردوں کی فکری اڑان استاد کے دم توڑتے ہی تھم جاتی ہے اور ایسے شاگرد تھوڑی بہت شہرت اور مقبولیت کے مالک بنتے ہی استاد کا نام لینا بھی معیوب سمجھنے لگتے ہیں اور خود کو تلمیذ الرحمٰن اور علامہ زماں تصور کرنے لگ جاتے ہیں وہاں ابتداہی سے علیم اپنے استادوں کی تربیت اور ان کی خدمات کے معترف رہے ہیں اور ہر محفل میں بڑے احترام کے ساتھ ان کا نام لیتے ہیں اور یہ اعتراف وقت کے ساتھ ساتھ اور مضبوط اور استوار ہوتا جارہا ہے۔ چنانچہ

جب علیم کی نئی غزلوں کا مجموعہ ''طرحِ نو'' شائع ہوا تو علیم نے سب سے پہلے ان دو حضرات کی شاگردی کا کھلا اور برملا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ''ان اساتذہ کی خدمت میں (حضرت دانش فرازی اور حضرت راحتؔ صدیقی) جن کے سرچشمۂ فیض والتفات نے میری ذہنی ادبی اور علمی تشنگی کو سیرابی کے راز سے آشنا کیا''

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے علیم کی شاعری مشاعروں کی شاعری نہیں اور نہ وہ مشاعروں کے ٹائپ کے شاعر ہیں کلام ترنم سے نہیں بلکہ تحت اللفظ میں پڑھتے ہیں اور پڑھنے کا انداز بھی کچھ زیادہ متاثر کن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں عام مشاعروں میں بعض ادبی اور فنی اعتبار سے بہت کم درجے کے اور کرتب باز قسم کے شاعر میدان مار جاتے ہیں، علیم کوئی خاص تاثر قائم کرنے اور اپنی شخصیت کی چھاپ چھوڑ جانے میں ناکام رہ جاتے ہیں۔ البتہ اخبارات ورسائل اور کتابوں میں انکی شاعری کامیابی کے جھنڈے گاڑتی رہتی ہے۔

جہاں تک تخلیق ادب اور شعر گوئی کا مسئلہ ہے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ انتہائی پرسکون ماحول اور کاغذ قلم کی موجودگی کے بغیر ایک مصرع کی تخلیق بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن علیم کا دماغ، شعروشاعری اور تحقیق لکھنے لکھانے کے معاملے میں شاید Computerized واقع ہوا ہے کہ چلتے پھرتے اور دوران سفر بھی دماغ کی بھٹی میں شعر پک رہے ہوتے ہیں اور جیسے ہی بیٹھنے اور فرصت کے چند لمحات میسر ہوجاتے ہیں وہ ڈھلے ڈھلائے اشعار کاغذ کے ٹکڑوں پر منتقل ہوجاتے ہیں اس کے علاوہ دفتر میں بھی روزمرہ کاموں کو انجام دیتے ہوئے چند اشعار کا ہوجانا تو لازمی سی بات ہے۔

علیم نے ٹمل ناڈو میں اردو کے نام سے یہاں اردو کی پیش رفت کا ایک جامع تذکرہ پیش کیا ہے۔ اس میں کئی غلط بیانیاں اندراج پاگئی ہیں تاہم چونکہ یہ اس علاقے کا تذکرہ محفوظ کرنے کی پہلی کوشش ہے۔ اس لئے انہیں نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا ہے بقول پروفیسر عابد صفی مرحوم۔ (شعبۂ اردو مدراس یونیورسٹی)

> ''ان کے تذکرہ ٹمل ناڈو میں اردو اور ٹمل ناڈو کے مشاہیر ادب میں بھی بعض مقامات پر اس طرح کی بات نظر آتی ہے۔ شعرا کے کلام اور نثر نگاروں کی تخلیقات پر اظہار خیال کرتے ہوئے اکثر مقامات پر اپنی رائے مسلط کرنے لگتے ہیں جس سے تذکرہ کا منصفانہ کردار باقی نہیں رہتا ان

کمزوریوں پر ڈاکٹر نجم الہدیٰ (صدر شعبۂ اردو عربی فارسی ، مدراس یونیورسٹی) نے روشنی ڈالی ہے۔

(مقدمہ ۲۳) (تاریخ نثر اردو ص ۳۱۴ مطبوعہ ۲۰۰۸)

علیم نے ٹمل ناڈو اردو پبلیکیشنز نامی ادارہ قائم کیا ہے۔ جس کے تحت نہ صرف ان کی بلکہ دوسرے ارباب قلم کی بھی کتابیں اور رسالے باقاعدگی کے ساتھ چھپتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بھی وہ نہایت متحرک اور فعال واقع ہوتے ہیں۔ بار بار کاتبوں، کمپیوٹر اور پریسوں کے چکر لگانا۔ انہیں ہدایات دینا، بائینڈروں اور پریس مینوں کی دلجوئی کرنا، اُجرت کے علاوہ بھی ان کو افزود رقم دیتے رہنا ان پر افزود نوازشیں کر کے ان کا دل جیتنا، غرض اس طرح کے بیسوں ٹوٹکے علیم زنبیل میں پڑے ہوئے ہیں اور میرا یہ کئی بار کا مشاہدہ ہے کہ بعض پریسوں میں علیم کے داخل ہونے کے ساتھ ہی چہروں پر ایک طرح کی بشاشت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس طرح علیم نے ٹمل ناڈو کی دنیائے طباعت واشاعت میں ایک انقلاب برپا کرتے ہوئے اپنی اور دوسرں کی کتابیں نہایت اعلیٰ پیانے پر شائع کیں اور اس تمام ترقی کے پس منظر میں ان کی ذاتی لگن اور دلچسپی کارفرما تھی جو انہیں ایک لمحہ کے لئے بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔

علیم کی ان ادبی خدمات کا ہندوپاک کے مقتدر ارباب فکروفن اور نقادوں نے دل کھول کر اعتراف کیا ہے اور ان کے مضامین نظم ونثر اور شعروشاعری کے بارے میں اور ان کے فکروفن پر اس قدر تحریریں جمع ہوگئیں کہ ان کے مجموعے ترتیب دئے جانے لگے۔ برصغیر ہندوپاک میں اور بھی ادیب وشاعر حضرات ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگوں کا علمی سرمایہ علیم کی بہ نسبت مقدار اور معیار سے بھی زیادہ ہے اور مواد وزبان کے اعتبار سے وقیع ومعتبر بھی لیکن تنقیدی اور توصیفی تحریروں کا جہاں تک تعلق ہے یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس قدر متنوع مختلف مکاتیب سے تعلق رکھنے والے چھوٹے بڑے نقادوں نے ہندوپاک کے کسی دوسرے فن کار پر نہیں لکھیں اور کسی کے فکروفن کا جائزہ اس قدر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ نہیں لیا گیا، بقول ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید:

> ”قابل ذکر بات یہ ہے کہ علیم صبؔا نویدی کے فن پر ناقدوں نے بروقت اور سیر حاصل انداز میں قلم اُٹھایا ہے بہت کم فن کار ہوں گے جن پر ان کے دور میں تنقید نے ایسی توجہ دی ہو جیسی کہ علیم صبؔا نویدی کی شاعری پر، سچ پوچھئے تو ناقدین کے ان مضامین کا ٹھیک سے حساب ہے نہ شمار تا ہم ان کے فن پر شائع شدہ مضامین کے جو منتخب مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں ان میں ”لہجہ

تراش'' کاظم نائطی '' آسمان فن کا سفیر'' ڈاکٹر نجم الہدیٰ'' نقش بند'' ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید'' خامہ در خامہ'' ڈاکٹر محمد علی اثر اور'' روشن لکیر'' ڈاکٹر اختر بستوی'' عکس در عکس'' حکیم یعقوب اسلم ہیں اور اب ان کی نعتیہ شاعری پر تنقیدی مضامین کو مرتب کرنے کی سعادت مجھے حاصل ہو رہی ہے۔''

(نقش قلم ص ۶)

علیم کے استاد اور مربی دانش فرازی مرحوم نے ان کے تعلق سے بڑی سچی اور فیصلہ کن بات کہی تھی۔

''علیم صبا نویدی تعارف کے اس مرحلے سے گزر چکے ہیں جہاں انگلی کے اشارے سے بتایا جائے کہ وہ صبا نویدی ہیں۔ بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ صبا نویدی بعض بر خود غلط ڈھونڈورچی اور پھکو باز کی طرح اپنی شہرت کے پیچھے ڈنڈا لے کر نہیں پھرے ''نوک قلم'' کے ذریعہ سوچ کی شاہراہوں پر انہوں نے قدم رکھا ہے۔''

(رسالہ فروغ ادب، وانمباڑی ص ۱۷ مطبوعہ ۱۹۷۸ء)

نقادوں ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ اردو اکیڈمیوں اور سرکاری اداروں نے بھی ان کی خدمات کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے اور انہیں مختلف اعزازات و انعامات سے نوازا ہے۔

1. یوپی اردو اکیڈمی لکھنو 1975
2. ویسٹ بنگال اردو اکیڈمی کلکتہ 1980
3. بہار اردو اکیڈمی پٹنہ 1982
4. یوپی اردو اکیڈمی لکھنو 1984
5. یوپی اردو اکیڈمی لکھنو 1986
6. غالب اکیڈمی بنگلور 1989
7. آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنو امتیاز میر 1993
8. آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنو نوائے میر 1997
9. آل انڈیا غالب ایوارڈ غالب انسٹیٹوٹ، نئی دہلی 2006
11. آل انڈیا حمد و نعت اکاڈمی، دہلی علامہ شبلی ایوارڈ 2007

۲۰۰۷ء میں ٹمل ناڈو اسٹیٹ گورنمنٹ اردو اکیڈمی چنئی نے بھی انہیں ڈاکٹر عبدالحق ایوارڈ اور ۲۵ ہزار روپیوں کے نقد انعام سے نواز کر ان کی علمی ادبی اور تحقیقی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

۲۳ر ستمبر ۲۰۱۰ء کو ٹمل ناڈو کے گورنر سری سرجیت سنگھ برنالہ علیم صبؔا نویدی کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں "علامہ اقبال ایوارڈ" سے سرفراز فرمایا ہے۔ جس کا سہرا جناب مختار بدری کے سر جاتا ہے۔

۱۳ر فروری ۲۰۱۱ء میں انجمن اردو کوئمبتور نے علیم صبؔا نویدی کی علمی ادبی اور تحقیقی خدمات کے اعتراف میں "حضرت امیر خسرو ایوارڈ" چندر بھان خیال (نائب چیر مین نیشنل کونسل فار پرموشن آف اردو لانگویج) کے ہاتھوں سے دیا گیا ہے۔

اور علیم کی خدمات کا اعتراف اس انداز میں بھی ہورہا ہے کہ ان کے فکروفن پر بالواسطہ یا بالراست تحقیقی کام بھی مختلف یونیورسٹیوں میں انجام پارہا ہے۔ غالب شکایت ہی کرتے رہ گئے کہ ع

شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

پھر بھی غالب خوش قسمت ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کے کلام کی شہرت خوب ہوئی۔ لیکن علیم کی خوش قسمتی ہے ان کی زندگی ہی میں ان پر تحقیقی کام انجام پاچکا ہے اور ایک دو نہیں بلکہ چار چار بار چار مختلف یونیورسٹیوں میں۔

1. محمد جعفر جری نے حیدرآباد یونیورسٹی سے ''علیم کی شخصیت اور فن'' پر ڈاکٹر انوارالدین کے زیرِ نگرانی یم فل کے لئے مقالہ لکھا۔

2. اردو کے مشہور شاعر اور ادیب یس۔ سجاد بخاری نے مدراس یونیورسٹی سے ڈاکٹر نجم الہدیٰ کی زیرِ نگرانی آزاد غزل پر مقالہ لکھ کر یم فل کی ڈگری حاصل کی۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ مقالہ نرالی دنیا پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہوچکا ہے۔

3. محمد قاسم (کیرلا) نے بہار یونیورسٹی سے ڈاکٹر ناز قادری کے زیرِ نگرانی ''علیم صبا نویدی کے فکروفن'' پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

4. ۲۰۱۰ء میں محترمہ رونق ناز (ہزاری باغ) نے ڈاکٹر امیر احمد صدیقی کی زیرِ نگرانی جھارکھنڈ یونیورسٹی سے تحقیقی مقالہ ''اردو شاعری کے ارتقا میں علیم صبؔا نویدی کا حصہ'' لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

5. ڈاکٹر راحتؔ سلطانہ نے علیم کی نعتیہ شاعری پر ڈاکٹر ناز قادری کی نگرانی میں مقالہ لکھ کر

بہار یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

6. جناب سید صفی اللہ نے ''علیم صبؔا نویدی کی اردو خدمات'' پر ڈاکٹر سید سجاد حسین کے زیر نگرانی مقالہ لکھ کر مدراس یونیورسٹی سے یم فل کی سند حاصل کی۔

اپنی بات کو ختم کرتے ہوئے میں رازؔ امتیاز کا وہ حرف آخر بھی پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جو انہوں نے علیم کی شاعر اور شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

> ''علیم کی شاعری زخموں کی شاعری ہوتے ہوئے بھی حوصلوں کی شاعری ہے کیوں کہ انہوں نے زخموں کو چراغ بنالیا۔ پہلی ازدواجی زندگی کے تاریک دور میں ان چراغوں نے علیم کو زندہ رکھا تھا اور اب زندگی کے ایک نئے اور پُرمسرت دور میں یہی زخم ان کے روحانی ارتقا کے سفر میں چراغ راہ ہیں۔ ان کی شاعری پڑھنے والوں پر بھی زندگی اور زندگی کے نئے احساس اور تجربے کا در وا کرسکتی ہے۔''

حوالہ جات:

1)	طرحِ نو	علیم صبؔانویدی
2)	نقشِ قلم	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
3)	فروغِ ادب	دانش فرازی
4)	تاریخ نثر اردو	ڈاکٹر سید صفی اللہ شعبۂ اردو، مدراس یونیورسٹی

حکیم یعقوب اسلمؔ

مدیر ''چراغِ اردو'' وانمباڑی

۱۵؍نومبر ۲۰۱۱ء

☆☆☆

حرفِ آغاز

راز امتیاز

"نئے نام" کی نسل پرانی ہو چکی ہے اور اب تو اس نسل کے علمبرداروں کو یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ ان ناموں کو نیا کہنا کس حد تک درست تھا (یہ اور بات ہے کہ "نئے نام" کی وقعت زیادہ تر اس میں شامل پرانے ناموں کی وجہ سے تھی کیوں کہ دراصل پرانے نام ہی اُس وقت بھی نئی شاعری کر رہے تھے اور "نئے نام" لب کشائی کی مشق)

"نئے نام" سے کچھ عرصہ پہلے اور اس کے بعد نام نہاد جدیدیت کی جو تحریک، رو یا لہر چلی تھی وہ اپنا دائرہ دار سفر ختم کر چکی ہے۔ اس سفر میں کورس گانے والوں اور ان کے ساتھ تالیاں پیٹنے والوں کی ٹولیاں بھی تتر بتر ہو چکی ہیں۔ لیکن اس عرصے میں سنجیدہ نوجوان ادیبوں اور شاعروں کا ایسا طبقہ بھی اُبھرا جس کے نزدیک جدیدیت نہ ٹریڈ مارک موضوعات سے عبارت ہے نہ پرائیوٹ علامتوں سے، بلکہ جدیدیت شعری سطح پر جدید ذہن کا وہ ردِ عمل ہے جس میں کوئی لمحہ گذشتہ اور آئندہ کسی صدی سے منقطع نہیں ہے بلکہ ان دونوں کو سمجھنے، پرکھنے اور محسوس کرنے اور دیکھنے کا اظہار ذریعہ ہے۔ ان شاعروں اور ادیبوں کا "آج" وہ آئینہ ہے جس کے دونوں رُخ ۔۔۔ ماضی اور مستقبل ۔۔۔ روشن اور شفاف ہیں اور جو ٹوٹ کر "نگاہِ آئینہ بدست" میں عزیز تر ہو جاتا ہے۔

"لمسِ اول" کا شاعر اسی طبقے کا نوجوان ہے لیکن "لمس اول" کی نظمیں نام نہاد جدیدیت کے خلاف ردِ عمل کے طور پر نہیں لکھی گئیں۔ شاید اس انکشاف سے ہمارے ادبی پیمانوں کی کم مائگی کا احساس ناپسندیدہ حد تک شدید تر ہو جائے کہ علیم صبا نویدی نے یہ نظمیں "طرحِ نو" کی اشاعت ۱۹۷۵ء سے کافی عرصہ قبل یعنی ۱۹۶۸ء-۱۹۷۵ء تک کی مدت میں لکھی تھیں لیکن ان کی اشاعت ۱۹۷۷ء کے اواخر میں ہو رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان نظموں کا استقبال ——— آج کی بلکہ اس لمحے ——— کی تازہ ترین نظموں کی حیثیت سے کیا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ اگر ۱۹۷۰ء یا ۱۹۷۵ء میں یہ مجموعہ شائع ہوتا تو اس کا استقبال کس طرح کیا جاتا؟ اس سوال کا صحیح جواب ہمارے تنقیدی ادب کے کئی مفروضوں کی کھوکھلی عمارتوں کو مسمار کر سکتا ہے۔

آج جب کہ "نثری شاعری" ہمارے ادب کا تازہ ترین موضوع ہے۔ انتہائی پابند نظموں کی اشاعت اور ان کا پرجوش نہیں تو حوصلہ افزاء استقبال شاعری میں ہیئت کو بادشاہ اور مواد کو غلام بنانے کے یکطرفہ رجحان کی قلعی کھولنے کے لئے کافی ہے لیکن نام نہاد جدیدیت کے ہاتھوں میں ایک ٹرمپ کارڈ جوکر کی شکل میں یعنی جدید نقاد اب بھی موجود ہے۔ اگلے پتے کا انتظار کیجئے۔

"لمس اول" اس ادبی نشاۃ ثانیہ کی توانائی کا ایک اور مسلّم ثبوت ہے جو تمل ناڈو میں انجمن مصنفین اُردو، مدراس، کے قیام (۱۹۵۸ء) سے شروع ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں دانش فرازی، کاوش بدری، فرحت کیفی، راز امتیاز، ادیب بھارتی، فندوی باقوی اور اسمٰعیل رسکی جیسے شعراء و ادباء نے اس ریاست میں اُردو ادب کو کرجھوں والی غزل کے دور سے رہا لنے اور فکر و نظر کے نئے آفاق سے روشناس کرانے کی انفرادی اور اجتماعی کوششیں کیں۔ علیم صبا نویدی اور عزیز تمنائی جیسے شعراء اسی نشاۃ ثانیہ سے بالراست یا بالواسطہ طور پر متاثر ہوئے۔ موخر الذکر کے سانٹوں کے مجموعے "برگِ نوخیز" کی ادبی

اہمیت مشکوک سہی (اس مجموعے پر پروفیسر رشید احمد صدیقی کی کڑی تنقید سے اختلاف بے حد مشکل ہے) لیکن مذکورہ نشاۃ الثانیہ کے سیاق وسباق میں اس مجموعے کا بھی ایک کردار ہے۔ فرحت کیفی کے ترائیلوں کا مجموعہ ''پتہ پتہ بوٹا بوٹا'' نہ صرف تمل ناڈو کی ادبی تاریخ میں ایک سنگ میل ہے بلکہ اس کی ادبی اہمیت بھی ناقابل انکار ہے۔ علیم صبا نویدی کی غزلوں کا مجموعہ ''طرحِ نو'' اس نشاۃ الثانیہ کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت تھا کیوں کہ اس وقت علیم ہمارے ادبی کارواں کے سب سے کمسن ہم سفر تھے لیکن سب سے پہلے غزلوں کا مجموعہ اُنہی کا شائع ہوا۔ ''طرحِ نو'' کی اشاعت ان کی ''جرأتِ رندانہ'' تھی اور اب ''لمسِ اول'' کی اشاعت ان کی ''شوخیٔ طبع'' کی دلیل ہے، کیوں کہ جن حضرات نے ادب کے مفروضات کی روشنی میں ''طرحِ نو'' کے شاعر کو خوش آمدید کہا تھا ان کے لئے ''لمسِ اول'' کے شاعر سے ہاتھ ملانا آسان نہ ہوگا۔ مگر جہاں تک علیم کا تعلق ہے وہ ''طرحِ نو'' اور ''لمسِ اول'' دونوں میں کہیں بھی خود سے اجنبی نہیں ہیں۔ یہ دونوں مجموعے اظہار کی نیرنگیوں کا دلچسپ ثبوت ہیں جس کی روشنی میں ہر پانچ سال بعد شاعری میں انقلاب لانے کے مدعیوں کو اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کرنی پڑے گی۔

دراصل علیم ہیئت کے مسائل میں کبھی نہیں اُلجھے اور حقیقت ہے بھی یہی کہ کسی شاعر کا ہیئت کے مسائل میں بہت زیادہ منہمک ہوجانا اس کی فکری کم مائیگی نہیں تو فکری احساس کمتری کا ثبوت ہے۔ جان بوجھ کر ابہام پیدا کرنا، نجی علامتیں وضع کرنا، اپنے ساتھ شائع ہونے والے پانچ سات شاعروں کے سوا پوری کائنات کو صمٌ بکمٌ عمیٌ سمجھنا اچھے اور بڑے شاعر کی نشانی نہیں ہے۔ شاعری اپنے لئے بھی ہوسکتی ہے دوسروں کے لئے بھی۔ گھر کی بلی کی موت پر بھی نظم ہوسکتی ہے اور جواہر لال نہرو کے انتقال پر بھی لیکن کسی شاعر کو یہ حق نہیں کہ وہ صرف جدید بننے کے لئے خیال کو الفاظ کی صلیب پر لٹکا دے۔ اس کا فرض تو یہ ہے کہ نئے تصورات تخلیق کرے اور پرانے تصورات کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے اُنھیں نئی زندگی عطا کرے۔

علیم کی شاعری زخموں کی شاعری ہے، ایسے انسان کے سفر کی داستان ہے جو اپنے زخموں کی روشنی میں سماج کے گھناؤنے راستوں سے گزر رہا ہے اور ایک بلند اور اعلیٰ آدرش کی تلاش میں ہے۔

''طرحِ نو'' میں زخموں کی مہک بہت زیادہ ہے اور تلاش کی اُمنگ کم۔ ''لمسِ اول'' میں معاملہ اس کے برعکس ہے لیکن شخصیت ایک ہی ہے اور سفر بھی ایک۔ دونوں مجموعوں میں احساسات کا رنگ و آہنگ بھی کئی جگہ ملتا جلتا ہے مثلاً ''طرحِ نو'' ہی کا ایک شعر ہے:

ہمارے راستے جب راہِ آسماں سے ملے　　بہت سے سورج چہرے دُھواں دُھواں سے ملے

اور ''لمسِ اول'' کی ایک نظم ''تقاضوں کا سفر'' کا آخری بند ہے:

تم تو دو گام ہی چلتے ہو ٹھہر جاتے ہو
مجھ سے پہلے ہی خلاؤں میں بکھر جاتے ہو
مجھ کو کیا اس سے غرض ہے کہ کدھر جاتے ہو
طے کیا میں نے اکیلے ہی خیالوں کا سفر

''طرحِ نو'' کا یہ شعر پڑھئے:

رُتوں کی آگ میں عنبر فشاں ہوئے ہم لوگ
گلوں کی چھاؤں میں پل کر جواں ہوئے ہم لوگ

اور پھر ''لمسِ اول'' کی نظم ''نئی رتوں کے بھید'' کا یہ پہلا بند دیکھئے:

سلگتی چھاؤں میں جب بھی رواں ہوئے ہم لوگ
لہو کی دھوپ کو پی کر جواں ہوئے ہم لوگ
جہاں ہٹائے گئے جاوداں ہوئے ہم لوگ
زباں جو کاٹی گئی خوش بیاں ہوئے ہم لوگ

''طرح نو'' میں ہمیں یہ شعر ملتا ہے۔

صعوبتوں کا سفر اس نے طے کیا ہے مگر
نہ ہاتھ میلا ہے اس کا نہ پاؤں میلا ہے

اور ''لمسِ اول'' کی نظم ''لہو کی موت'' کا یہ پہلا بند ہے

گلے میں باندھ کے یوم المنشور نکلا ہے
ستم رسیدہ جام صبور نکلا ہے
بتا رہے ہیں یہ آثار دور نکلا ہے
وہ بچ بچا کے سفر پر ضرور نکلا ہے

علیم کی شاعری زخموں کی شاعری ہوتے ہوئے بھی حوصلوں کی شاعری ہے کیوں کہ اُنھوں نے زخموں کو چراغ بنا لیا۔ پہلی ازدواجی زندگی کے تاریک دور میں ان چراغوں نے علیم کو زندہ رکھا تھا۔ اور اب زندگی کے ایک نئے اور پرمسرت دور میں بھی زخم اُن کے روحانی ارتقاء کے سفر میں چراغ راہ ہیں۔ ان کی شاعری پڑھنے والوں پر بھی زندگی اور زندگی کرنے کے نئے احساس اور تجربے کا دروا کرسکتی ہے۔

رزاق اثر
جنرل سکریٹری انجمن مصنفین اردو تملناڈو

☆ ☆ ☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شمس الرحمن فاروقی

علیم صبؔا نویدی جنوبی ہند کے ممتاز اُردو شاعر ہیں۔ ان کی پابند نظموں کا یہ مجموعہ "لمسِ اوّل" ان کی مشّاقی اورزبان پر قدرت کی روشن دلیل ہے۔ بے قافیہ اور آزاد نظموں کے اس دور میں ردیف اور قافیہ کے علاوہ مصرعِ ترجیع کی پابندی قابلِ داد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ "طرح نو" کی طرح ان کا یہ نیا مجموعہ بھی مقبول ہوگا۔

۳رفروری ۱۹۷۸ء دہلی

ڈاکٹر گیان چند

علیم صؔبا نویدی صاحب مدراس کے غیر اردو علاقے میں اردو کی شمع جلائے بیٹھے ہیں اور اس شمع کے آگے شعرخوانی کر رہے ہیں۔ صؔبا نویدی جدید شاعر ہیں لیکن ان کی جدت کی جڑیں قدیم تک پہنچتی ہیں۔ اس دعوے کا ثبوت ان کا زیر نظر مجموعہ ''لمس اول'' ہے۔

انگریزی کا ایک محاورہ ہے۔ ''نئے شیشے میں پرانی شراب'' صؔبا صاحب نے پُرانے شیشے میں نئی شراب پیش کی ہے۔ جو پُرانے اور نئے لوگوں کو پسند آئیگی۔ ان کا مواد نیا ہے ہیئت پُرانی۔ ایک روایتی صنف مربّع ہے۔ سوؔدا نے اسے مرثیوں میں بکثرت استعمال کیا۔ اس کا ہر بند چار مصرعوں کا ہوتا ہے۔ پہلے بند کے چاروں مصرے باہم مقفیٰ۔ بعد کے بندوں کے تین مصرے کسی اور قافیے میں اور چوتھا یعنے ٹیپ کا مصرع پہلے بند کے ساتھ مقفیٰ۔ علیم صؔبا صاحب کے اس مجموعے کی تمام نظمیں سوؔدا کے اس مربّع کی شکل میں ہیں۔ مربّع کی ایک دوسری شکل وہ ہے جو اکبرالہ آبادی نے ''دلی دربار'' میں برتی یعنی ہر بند کے چاروں مصرعے باہم مقفیٰ ہوتے تھے اور ہر بند کا قافیہ مختلف تھا۔ صؔبا صاحب کی نظموں میں ٹیپ کا مصرع اکثر اوقات بدلتا رہتا ہے۔ لیکن بعض اوقات پہلے بند کا چوتھا مصرع ہی بعد کے بندوں میں دہرادیا جاتا ہے۔

آزاد نظم کے اس دور میں انہوں نے اپنے لئے شدید مقفیٰ نظم کو پسند کیا ہے۔ ان کی بعض ہندی بحر کی نظموں میں مختلف بندوں کے مصرعوں کے طول میں بھی کچھ کمی بیشی ہوگئی ہے۔ لیکن میرے لئے ان کی نظموں کی ہیئت چنداں اہم نہیں۔ میں ان کے مطالب سے متاثر ہوتا ہوں۔ میں نے ان سب نظموں کے تینوں حصے پڑھے ہیں اور وہ مجھے بے حد پسند آئے ہیں۔ صؔبا صاحب نے ایک راہ دکھائی ہے کہ نئی زندگی اور نئے انسان کے نفسیاتی مسائل کو ابہام کے بغیر بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔ علامت نگاری کا یہ خوش گوار اور کامیاب تجربہ ہے۔

گیان چند
صدر شعبۂ اردو
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

۲۸ نومبر ۱۹۷۷ء

ڈاکٹر وحید اختر

گذشتہ چند برسوں سے جدیدیت کے فیشن کے زیرِ اثر جو شاعرانہ ہیئتی تجربے ہو رہے ہیں اُنھیں دیکھ کر مجھے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ ہمیں اپنی شاعری کے امکانات کی توسیع کے لئے کلاسیکی ادب کی طرف واپس جانا چاہئے۔ روایت سے یکسر منقطع تجربات ہمارے شعری مزاج کی ترجمانی کا حق بمشکل ہی ادا کر سکتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ علیم صبانویدی نے ایک فراش شدہ کلاسیکی ہیئت کو نئی معانی کے ساتھ زندہ کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔

علیم صبانویدی اپنی شاعرانہ اہلیت کا ثبوت "طرحِ نو" میں دے چکے ہیں سال ہا سال کے خالی وقفہ کے بعد ٹمل ناڈو کی سرزمین سے جو اُردو علاقے سے دور افتادہ ہے قابلِ لحاظ صلاحیت رکھنے والے شعرا کی ایک فصل اُٹھی۔ یہ شعراء کلاسیکی روایت سے آگاہ بھی ہیں اور اسے عہدِ حاضر کے تجربات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں اسی کے ساتھ شاعری کے بدلتے ہوئے محاورے پر بھی اُن کی نظر ہے۔ عزیز تمنائی، کاوش بدری کے ساتھ ساتھ اس ذیل میں علیم صبانویدی کا نام بھی آتا ہے۔

"لمسِ اول" میں نویدی نے مربع کی ہیئت میں نظمیں کہی ہیں۔ ہر نظم میں تمام بند چار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ پہلے تین مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہیں اور ہر بند کا ہر چوتھا مصرع باقی ٹیپ کے مصرعوں سے ہم آہنگ ہے۔ اس ہیئت کو قدما نے تو برتا تھا۔ لیکن عہدِ جدید میں اس کو برتنے کی طرح "طرحِ نو" کے شاعر نے "لمسِ اول" میں ڈالی ہے۔ قافیہ اور ردیف کی جھنکار سے نہ صرف موسیقیت پیدا ہوتی ہے بلکہ نظم کی داخلی وحدت کو ہیئت کی خارجی وحدت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اس تجربہ میں "لمسِ اول" کی بیشتر نظمیں کامیاب ہیں۔

مجموعہ کا آغاز نئی قسم کی نعت سے ہوتا ہے اور اختتام نئے انداز کی حمد پر ہوتا ہے۔ انسان کامل سے خدا کے عرفان تک کے اس سفر میں شاعر عام انسانی تجربات، واردات، عہدِ موجود کے تقاضوں اور خطروں، فرد کے خوابوں اور شکستوں، اُمیدوں اور مایوسیوں، نئی اُمیدوں اور نئے چیلنجوں کی منازل سے گزرتا ہے۔ یہ روحانی سفر ارضیت کی زنجیر سے بندھا ہوا ہے۔ جس کی کڑیاں باہم دیگر پیوست ہیں۔

علیم صبانویدی نے شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ التزام برتا ہے کہ ایک آئیڈیل سے خالقِ مطلق تک کے سفر کے تمام مراحل داخلی طور پر بھی باہم مربوط اور ہم آہنگ نظر آئیں۔

"لمسِ اول" جو ایک خارجی ہیئت اور شعری تجربے کی داخلی وحدت کو ہم آہنگی دینے کے تجربے پر مشتمل ہے۔ اپنے نئے پن کے لحاظ سے ہم عصر شعری ادب میں توجہ کا مستحق ہے۔

وحید اختر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یوپی)

کھلتے رنگ

صبح تخلیق

مقام ''لا'' سے نکلا صبح کو جب نور کا پیکر
ہوا پھر جوہر آئینہ، ہر بجھتا ہوا جوہر
اُجالوں کی روپہلی چھاؤں میں تھا زیست کا منظر
محبت نے بھی لی انگڑائی جلووں کا کھلا دفتر

سمجھ میں آئی پھر ذہن رسا کو غایت ہستی
بہ ظرفِ ہوش پھر بانٹی گئی توحید کی مستی
اُفق کے نُور کو چُھونے لگی ویران سی بستی
پہاڑوں نے سروں سے پھینک دی پھر دُھند کی چادر

مہکتے پھول بھی تھے جگمگاتے چاند تارے بھی
سُلگتی ریت کے تودے، سمندر بھی کنارے بھی
پرستاران باطل بھی، کہیں افسوں کے مارے بھی
ظہورِ قدس کے آگے جھکایا سب نے اپنا سر

الوہی ساز پر چھیڑے گئے نغمے محبت کے
اُبلنے لگ گئے ہر گام پر چشمے مسرت کے
کہ تا حدِ نظر چھائے ہوئے بادل تھے رحمت کے
سراپا جنتِ نظارہ تھا فاران کا منظر

زمیں کی خاک نے اُٹھ کر چُھوا عرشِ معلیٰ کو
حیاتِ گلفشاں بخشی گئی ہر ایک صحرا کو
کیا حیران جس جلوے نے ذوقِ چشمِ موسیٰ کو
حرا کے غار سے نکلا وہی خورشیدِ ضوگستر

☆☆☆☆

عالم عالم گردش

من کے بھیتر جو ساگر ہے آنکھوں سے بہہ جائے کیوں
سمے سمے کی بات پہ کوئی ڈگر ڈگر پچھتائے کیوں
جہاں دہکتی آگ بجھی ہے، شبنم اشک بہائے کیوں
جہاں لہو روتے ہیں موتی، تارے توڑ کے لائے کیوں

وقت کے دھارے اور سمندر روکے سے کب رکتے ہے
عالم عالم گردش میں ہیں، ہم ہی موڑ پہ ٹھہرے ہیں
ہوتا ہے محسوس ہمیشہ کچھ جاگے کچھ سوئے ہیں
ایسے میں آئینہ دل کا کوئی ہمیں دکھلائے کیوں

تیور سے یہ بات کھلی تھی طوفاں آنے والا ہے
دھجی پھر پربت کی خوب اُڑانے والا ہے
گھورا اندھیرا سینہ تانے شور مچانے والا ہے
ایسے میں کیا سوجھی تم کو، تم نے دیپ جلائے کیوں

غم ہے اک آوارہ راہی، لاکھوں رستے ناپے گا
مٹی کی خوشبو کے سہارے گھر گھر یہ دستک دے گا
کون ہوا بربادِ تمنا یہ آوارہ کیا سوچے گا
اس کا رشتہ اَن مٹ رشتہ اس سے ہم گھبرائے کیوں

کہیں اندھیرا، کہیں اجالا، کہیں گلِ تر، کہیں ببول
گاہے انا الحق، گاہے دمِ سقراط تو گاہے یدِ رسول
گاہے دہکتی آگ کی باہیں، گاہے مہکتے پھول ہی پھول
اتنے پردے جب آگے ہیں اصلی روپ دکھائے کیوں

☆☆☆☆

نئی دشائیں اُبھر آئیں

دھنک کی سوچ میں رنگوں کے خواب بکھرے ہیں
نکل کے اپنی فضا سے گُلاب بکھرے ہیں
بنامِ صبر و سکوں اضطراب بکھرے ہیں
بڑی ہی شان سے خانہ خراب بکھرے ہیں

بھرم کُھلے نہ کہیں دل کے آبگینوں کا
نہ راز پائے کوئی زخم خوردہ سینوں کا
بسا ہے جھیل پہ یہ شہر جو سفینوں کا
یہیں یہ ٹھہرے ہوئے آفتاب بکھرے ہیں

رُتوں کے روپ بھی بدلے ہیں روزگار کے ساتھ
نئی دشائیں اُبھر آئیں اعتبار کے ساتھ
جو حاشیوں میں سمٹ آئے اختصار کے ساتھ
ورق ورق وہ کہیں باب باب بکھرے ہیں

جو آگ دل میں سُلگتی تھی وہ بجھی لیکن
کسک جو درد کی تھی وہ نہیں رہی لیکن
ہماری پیاس سمندر کو پی گئی لیکن
ہمارے ذہن کی تہہ میں سراب بکھرے ہیں

لہو میں ڈوبے ہیں اپنے ہی دل جلے کتنے
عجب نظارے یہاں ہم نے ہر قدم دیکھے
یہی ہے فکر سمٹ جائیں خول میں اپنے
مگر ہنوز ادھورے حساب بکھرے ہیں

☆☆☆☆

● پت جھڑ کا نوحہ

نا دیدہ لہروں کے دکھ میں ایک سمندر روتا ہے
گندے ذہن کے جوہڑ میں لفظوں کا پیکر روتا ہے
دو وادی کے بیچ میں کوئی راہی اکثر روتا ہے
صحرا صحرا پیاس بجھا کر بادل گھر گھر روتا ہے

کتنے بھیدوں کے ملبے میں اس دھرتی کی سانس رُکی
اک تنہا برگد کی چھاؤں میں چہروں کی ہے بھیڑ لگی
اپنے سے لگتے ہیں سارے، نہیں ہوئی پہچان کبھی
نا دیدہ لہروں کے پیچھے گویا سمندر روتا ہے

میں ہوں ''میں'' میری بھی گرہ میں کیا ہے افسانوں کے سوا
مجھ سے کیا آدرش کا رشتہ کوئی تو سمجھائے ذرا
میری سوچ کا ہر سرمایہ، رستہ رستہ پھیل گیا
مجھ سے ملکے جانے کیوں تخلیق کا جوہر روتا ہے

پت جھڑ کے ماروں کا نوحہ، پیلی فضا کا سونا پن
آوارہ پتوں کی صدا میں ٹوٹے سپنوں کی دھڑکن
دھرتی کی ہر سانس کے پیچھے سسک رہا ہے میرا آگن
بیتی رُت کا قاتل لمحہ، منظر منظر روتا ہے

خالی مکاں کی چھت پر کب سے سایوں کی ہے بھیڑ لگی
دھوپ کی آہٹ سے گھبرا کر گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی
شب کے سناٹے میں اکثر میں نے ایسی چیخ سنی
جیسے دھند کی چادر تانے میرا مقدر روتا ہے

☆☆☆☆

سوکھا اجالا

سبزدر سبز رُتوں کا ہے جو چہرا سوکھا
ہر نظر خشک ہے، ہر ذوقِ تماشا سوکھا
جانے کس دھوپ کے سائے میں نظارا سوکھا
کیا کہوں آپ سے اس دور میں کیا کیا سوکھا

خشک ذہنوں نے تبسم کی نمی چھینی ہے
اور چٹانوں نے کہیں شیشہ گری چھینی ہے
بڑھ کے خود کتنے خداؤں نے خودی چھینی ہے
بھیگ کر کتنے اندھیروں میں اجالا سُوکھا

پیار کی چھاؤں تلے ٹوٹ کے برسے بادل
شور پانی کا تھا ہر منظرِ پستی چل تھل
سوئے آفاق لپکتے تھے ہزاروں آنچل
پی کے پانی کو مگر پیاس سے دریا سوکھا

مجھ کو ہو کیوں گلۂ تنگیٔ دامن لوگو
چوم لیتا ہے قدم میرا بھی گلشن لوگو
مجھ کو ہی چھُو کے گزر جاتا ہے ساون لوگو
مری دنیا کا نظارہ نہیں روکھا سوکھا

بھیگی رُت، سرد ہواؤں کا پیمبر میں ہوں
صبحِ تخلیقِ دو عالم کا مقدر میں ہوں
آئینہ ساز ہوں آئینہ کا جوہر میں ہوں
ہاں کسی شئے سے نہیں ہے مرا رشتہ سوکھا

اب بھی ہے ہر ورقِ گل پہ لہو کی تحریر
چھن رہی ہے در و دیوار سے میری تنویر
چھو گئی عرشِ معلیٰ کو قلم کی تقدیر
پھر بھی اک پیڑ کی مانند ہوں تنہا سوکھا

☆☆☆☆

جدّت کا لمس

سرگرمِ کاروادئ آشفتگی میں تھے
لب بستہ ہم کبھی چمنِ آگہی میں تھے
ہم مطمئن تھے، شاد تھے یا برہمی میں تھے
ہاں اپنی جستجو کی نئی روشنی میں تھے

خوش فہمیاں کرشمہ دکھاتی ہیں کچھ عجیب
جو کچھ بھی ہم نگاہ میں ہیں، وہ نہیں ''نصیب''
ہر سمت طوق ، دارورسن ، ہر قدم صلیب
تھی دھوپ ہم ہی سایۂ آشتی میں تھے

وابستہ تجھ سے ہو کے عجب ماجرا ہوا
چھانی جہاں کی خاک بہ ایمائے مدعا
آخر ہمیں ملا تو یہی اک صلہ ملا
محسوس ہو رہا تھا کہ تیری گلی میں تھے

چہروں کی بھیڑ دیکھ کے اُکتا گیا تھا دل
خود اپنی چھاؤں سے کبھی تھرا گیا تھا دل
کچھ اس خیال سے بھی سکوں پا گیا تھا دل
کچھ غم شناس لوگ رہِ زندگی میں تھے

تھا جن کے لب پہ قتل سے پہلے لہو کا رنگ
بادل کی رتھ پہ جن کی مچلتی ہوئی امنگ
چہرے تھے جن کے دھند میں، چھایا ہوا تھا زنگ
ہاتھوں میں آفتاب لئے روشنی میں تھے

بدلا مزاج دہر تو ہم بھی بدل گئے
جدت کا لمس تھا نئے سانچے میں ڈھل گئے
شبنم سے آگ برسی تو پتھر پگھل گئے
کیا ان کا ذکر جورہِ فرسودگی میں تھے

☆☆☆☆

● اُمنگوں کی اُداسی

فرسودہ روایات کا دفتر بدلو
ابلاغ و تخیل کا مقدر بدلو
آئینہ اسلوب کا جوہر بدلو
آج اپنی تمناؤں کے تیور بدلو

سناٹے کے آنگن میں پریشاں سورج
سرتابہ قدم چاک گریباں سورج
زندانِ روایات میں حیراں سورج
ماحول، یہ انداز ، یہ منظر بدلو

لب تشنہ اُمنگوں کی اداسی کی قسم
ڈوبی ہوئی نبضِ غم ہستی کی قسم
قطروں کو ترستی ہوئی دھرتی کی قسم
پیاسا ہے سمندر تو سمندر بدلو

آدابِ خرابات بدل جائینگے
اس دور کے سانچے میں وہ ڈھل جائینگے
دل تندیٔ صہبا سے پگھل جائینگے
ساقی کی یہ ایما ہے کہ ساغر بدلو

سورج ہے چھپا ہاتھ کی ریکھاؤں میں
پیاسے ہیں سمندر کئی صحراؤں میں
زخموں کی دبی چیخ تمناؤں میں
پیراہن الفاظ برابر بدلو

☆☆☆☆

● عذاب کا خوف

کچھ تو سرمایۂ ہنر رکھ لیں
آبرو اپنی عمر بھر رکھ لیں
دل کو ہر موڑ باخبر رکھ لیں
یعنے حالات پر نظر رکھ لیں

لوگ پوچھیں گے قصہ پت جھڑ کا
کس طرح خوابِ تازگی ٹوٹا
شجرِ درد سے لہو ٹپکا
برگِ افسردہ ہاتھ پر رکھ لیں

ہر قدم پر بچھے فریب کے جال
ہوگئی ہیں صداقتیں پامال
ہیں شکستہ نگاہ کے پروبال
ساری قدروں کو اپنے گھر رکھ لیں

لوگ لے آئے داستانِ دراز
ان میں کتنے ہیں صاحبِ اعجاز
جلوہ گر، جلوہ ساز، جلوہ طراز
اپنی روداد مختصر رکھ لیں

ختم ہوجائے کب متاعِ قرار
بند ہوجائیں گے بھرے بازار
احتیاطاً بہ دیدۂ خوں بار
اپنے دامن میں کچھ گہر رکھ لیں

ہر قدم پر ہے احتساب کا خوف
ایک انجانے انقلاب کا خوف
ایک ڈستے ہوئے عذاب کا خوف
اب قلم کو لہو میں تر رکھ لیں

☆☆☆☆

● بھید کھلے

دہن ہو زخم کا وا، آگہی کا بھید کُھلے
سلگتے درد کی بے چارگی کا بھید کُھلے
نکل پڑے جونہی خوشبو کلی کا بھید کُھلے
کھلی فضا میں کسی دن کسی کا بھید کُھلے

یہ ذکر خلد، یہ غلمان کی بات، قصۂ حور
یہ سلسبیل کے افسانے، داستانِ قصور
یہ عرش و فرش کے جلوے، یہ روشنی کا ظہور
انہیں سے سلسلۂ آدمی کا بھید کُھلے

یہ شہر جس میں چٹانوں کا انجماد سا ہے
یہ آشتی کی فضائیں جہاں فساد سا ہے
تعلقات کی سطحوں پہ کچھ عناد سا ہے
کبھی یہاں پہ بھی شیشہ گری کا بھید کُھلے

ابھی سفر کا ہے آغاز، تجربہ کیا ہے
کسے خبر کششِ جادۂ وفا کیا ہے
کہاں پہ اس کا ہے انجام، ابتدا کیا ہے
قدم بڑھائیں تو کچھ رہ روی کا بھید کُھلے

ستارے ہاتھ میں لے کر اُچھالتی ہے رات
گرہ کھلی جو کسی زلف کی، ہوی، برسات
ہے ماورائے سخن آج بھی مگر اک بات
سحر سے پہلے کہاں چاندنی کا بھید کُھلے

قدم قدم پہ ہے ابلاغ کا عجیب سوال
بھٹک گیا ہے خلاؤں میں کیا شعورِ جمال
بدل گئے ہیں اگر زاوئے تو کیا ہے وبال
جدیدیت سے جہاں شاعری کا بھید کُھلے

☆☆☆☆

• رنگوں کی بھیڑ

روشنی کے زہر کو چاٹے گی یہ شہروں کی بھیڑ
بدلیوں کی چھاؤں میں ہے رینگتے خوابوں کی بھیڑ
بٹ گئی کتنی وشاؤں میں حسیں سڑکوں کی بھیڑ
قوس کی باہوں میں ہے دہکے ہوئے رنگوں کی بھیڑ

بوڑھے پیڑوں کی جڑوں میں پیاس صحراؤں کی ہے
زرد پتوں میں انا زخمی تمناؤں کی ہے
رستہ رستہ اجنبی خوشبو نراشاؤں کی ہے
خود سے ہے الجھی ہوئی ٹوٹے ہوئے سپنوں کی بھیڑ

جم گئی ہے جانے کیوں آواز کی پلکوں پہ گرد
اور لَو دیتے ہوئے اعصاب ہیں صدیوں سے سرد
ہے فضا بے چہر گی کی، فکر ہے صحرا نورد
کھوکھلے جسموں میں ہے دم توڑتے لفظوں کی بھیڑ

میری تنہائی کے آنگن میں ہے پت جھڑ کا سفر
چند نامانوس سی پرچھائیوں کی ہے نفیر
ناتراشیدہ سے کچھ اصنام بھی ہیں دل پذیر
گم نہ ہو جائے خلاؤں میں کہیں سوچوں کی بھیڑ

ڈسنے لگتا ہے کبھی آہستہ سناٹے کا ناگ
ساز ہے لب بستہ، ملبے کے تلے سوتے ہیں راگ
چور دروازوں سے سورج کب سے برساتا ہے آگ
دھیان سے سنتی ہے سناٹے کی لَے، بہروں کی بھیڑ

☆☆☆☆

شہنائی کی لَو

رفتہ رفتہ مدھم پڑگئی شہنائی کی لَو
اپنی حد کو چھو نہیں پائی رعنائی کی لَو
اور جواں سی ہوتی گئی ہے تنہائی کی لَو
ہنگاموں پہ جب بھی پڑا ہے سنّاٹوں کا ہاتھ

ارمانوں پہ گرد جمی ہے ہلکے ہلکے پت جھڑ کی
آج تبسم کانپ گیا ہے آہٹ سُن کے پت جھڑ کی
اور فضا میں دھوم مچی ہے کالے کالے پت جھڑ کی
ہنگاموں پہ جب بھی پڑا ہے سنّاٹوں کا ہاتھ

کتنے موسم پیلے پڑگئے جنگل جنگل چیخ اٹھے
ٹہنی ٹہنی درد چھپائے من میں پل پل چیخ اٹھے
اور ہوا میں رنگ برنگی رات کے آنچ؛ چیخ اٹھے
ہنگاموں پہ جب بھی پڑا ہے سنّاٹوں کا ہاتھ

گیتوں کی سانسوں کی گرمی تیز نہ ہونے پائی
ہونٹوں پہ آواز کی لہریں کانپ گئیں ہرجائی
اور تباہی کود پڑی ہے لیتے ہوئے انگڑائی
ہنگاموں پہ جب بھی پڑا ہے سناٹوں کا ہاتھ

دور اُفق پر نور کا آنگن خاموشی سے بھیگ گیا
دُھند میں مہکا شام کا درپن خاموشی سے بھیگ گیا
اور خوشی کا دامن دامن خاموشی سے بھیگ گیا
ہنگاموں پہ جب بھی پڑا ہے سناٹوں کا ہاتھ

☆☆☆☆

زخموں کی دھوپ

صدیوں کی دھوپ ڈھل گئی لمحوں کی دھوپ میں
تلووں میں آبلے ہیں، اُمنگوں کی دھوپ میں
ہم جل رہے ہیں دیر سے چہروں کی دھوپ میں
احساس چیخ اٹھتا ہے زخموں کی دھوپ میں

صدیوں سے کتنی راتیں گزاری ہیں جاگ کر
سرگوشیوں میں محو تھے حیرت سے بام ودر
آئینہ ہاتھ میں لئے آئی حسیں سحر
ہم جب لہولہان تھے خوابوں کی دھوپ میں

جن سے حریم حسنِ معانی میں نور تھا
ابلاغ کے دھڑکتے دلوں میں سرور تھا
احساس جن سے زندہ، دمکتا شعور تھا
سنولا گئے وہ روپ ہی لفظوں کی دھوپ میں

لب پر خموشیوں کی جمی گرد تھی ہنوز
لہجے کے ساتھ ساتھ زباں سرد تھی ہنوز
تصویرِ صبحِ فکر و نظر زرد تھی ہنوز
ہم تپ رہے تھے اپنے ہی جسموں کی دھوپ میں

ممکن ہے ڈھل گیا ہو غم و درد کا غبار
ممکن ہے چھا گیا ہو ارادوں پہ اک نکھار
ممکن ہے گنگنائے رو پہلے سُروں میں پیار
جب دل نہا گیا ہے جھروکوں کی دھوپ میں

☆☆☆☆

● اُجالوں کا سمندر

میل کھائے ہوئے ان سپنوں میں رکھا کیا ہے
چند سنولائے ہوئے رشتوں میں رکھا کیا ہے
جلتے لب، بجھتی ہوئی آنکھوں میں رکھا کیا ہے
روشنی پی کے اجالوں کا سمندر بن جاؤ

تم کو ادراک و معانی کا سفر کرنا ہے
فن کے بہتے ہوئے پانی کا سفر کرنا ہے
کتنی صدیوں کی جوانی کا سفر کرنا ہے
روشنی پی کے اجالوں کا سمندر بن جاؤ

اوڑھتے تاریک ارادوں کا لبادہ نہ جیؤ
وحشی احساس کے ہاتھوں کی لکیریں نہ پڑھو
نور ہی نور ہے ہر سمت، سیاہی نہ پیؤ
روشنی پی کے اجالوں کا سمندر بن جاؤ

آتی جاتی ہوئی بے نور سی سانسوں سے کبھی
بنتی مٹتی ہوی قسمت کی لکیروں سے کبھی
اور ذہنوں میں سلگتی ہوی سوچوں سے کبھی
روشنی پی کے اجالوں کا سمندر بن جاؤ

کیوں اندھیروں کو ہتھیلی پہ لئے پھرتے ہو؟
کیوں یونہی ذات کے ماتھے کو سیہ کرتے ہو؟
کیوں یہاں اور بھی جینے کے لئے ڈرتے ہو؟
روشنی پی کے اجالوں کا سمندر بن جاؤ

جانے کس سمت چلے رات کی اُنگلی تھامے
اپنے احساس کی ڈستی ہوئی چادر اوڑھے
کچھ تو سوچو انہی سمتوں پہ جیوگے کیسے؟
روشنی پی کے اجالوں کا سمندر بن جاؤ

☆☆☆☆

● بولتی انگلیاں

پی گئیں میری سب آگہی انگلیاں
چاٹتی رہ گئیں زندگی انگلیاں
لمس سے بے خبر ہیں کئی انگلیاں
کب سے یخ بستہ ہیں آگ کی انگلیاں

ٹوٹ کر میں تو پھیلا اُفق تا اُفق
بٹ گیا جب لکیروں میں سادہ ورق
رہ گیا یاد آخر کو اتنا سبق
دل میں پیوست ہیں بولتی انگلیاں

سلوٹیں چہرۂ سنگ کی دیکھ لوں
آج کا ذکر کیا ہے کبھی دیکھ لوں
تم نہ سمجھو غلط، واقعی دیکھ لوں
کرچکیں یوں تو شیشہ گری انگلیاں

پیلی رُت، سُر مئی شام، نیلا گگن
دھیمی آنچوں کی زد میں پگھلتا بدن
سوچ کی تہ میں اک کسمساتی کرن
کانپ کر رہ گئیں پیڑ کی اُنگلیاں

ختم ہونے لگی روشنائی کی لو
پھٹنے والی ہے کچھ دے میں غم کی پَو
چاند کی نرم پلکوں سے اُتری ہے ضَو
کتنی خاموش ہیں سُوچتی اُنگلیاں

☆☆☆☆

● تبسم کا لہو

سناٹوں میں ڈھلتا ہوا خاموش سایہ گھر
بے نور لرزتے ہوئے کمروں کا مقدّر
ہر لمحہ سسکتے ہوئے چہروں کا سمندر
کیوں میرے تبسم کا لہو مانگ رہا ہے

ادراک کے ماحول سے نکلا ہوا چہرہ
احساس کے زخموں کو نہ سمجھا ہوا چہرہ
اور میلی روایات میں ڈوبا ہوا چہرہ
کیوں میرے تبسم کا لہو مانگ رہا ہے

دیوار کی شاخوں پہ لٹکتا ہوا سورج
ہر راہ میں بے چین بھٹکتا ہوا سورج
راتوں کی ہتھیلی پہ مہکتا ہوا سورج
کیوں میرے تبسم کا لہو مانگ رہا ہے

تنہائی کی دہلیز پہ بیٹھا ہوا ماضی
ہونٹوں پہ لئے درد کی اک موجِ خموشی
پھیلائے ہوئے آگے مرے، دستِ تباہی
کیوں میرے تبسم کا لہو مانگ رہا ہے

اک چہرے کے پیچھے کئی چہروں کو چھپائے
اک بھید کے اندر کئی بھیدوں کو دبائے
مانگے کی تجلّی میں کوئی آج نہائے
کیوں میرے تبسم کا لہو مانگ رہا ہے

☆☆☆☆

● شعور کا طواف

اگر غبار کا کوئی غلاف بھی ہوگا
مجھے یقین ہے آئینہ صاف بھی ہوگا
جو جرم اس سے ہوا ہے معاف بھی ہوگا
جہاں وفا ہے وہاں انحراف بھی ہوگا

کُھلینگے ہم پہ کہاں ورنہ زار ہائے الست
نشہ انا کا چڑھا ہے ہر ایک ذرہ ہے مست
بلند کوئی یہاں ہے نہ کوئی چیز ہے پست
یہ جانتا ہوں زمانہ خلاف بھی ہوگا

نظر میں بے درودیوار گھر کا منظر ہے
کہاں وہ شئے ہے جو پوشیدہ میرے اندر ہے
تمام عمر کا حاصل تو دیدہ تر ہے
کہ اس پہ پرتوِ لاف وگزاف بھی ہوگا

سُبو سے میکدہ خالی تو میکدہ بدنام
کہینگے دیر اُسے کیا جہاں نہ ہوں اصنام
ہے جہد زیست میں ہر وقت اک مسلسل کام
جہاں حرم ہے وہاں اعتکاف بھی ہوگا

ہے انجذابِ نظر کا ہی فیض رقصِ بہار
بیاضِ ترفِ تبسم ہے آنسوؤں کی پھوار
افق پہ رنگ کی جدول، لہر کا ہے اظہار
مرے وجود کا یوں انکشاف بھی ہوگا

مجھے جو دیکھ سکے وہ ادا شناس کہاں
مرے وجود پہ آفاق کا قیاس کہاں
میں پورا ایک صحیفہ ہوں اقتباس کہاں
مرے شعور کا اک دن طواف بھی ہوگا

☆☆☆☆

سپنوں کا شہر

میں نے جس کی خاطر پہروں پیار کے نغمے چھیڑے تھے
ہنستے گاتے نظّاروں میں کتنے جلوے دیکھے تھے
ان جلوؤں کی برکھا رُت میں دل کے ارماں بھیگے تھے

اس دنیا سے دور ہے یارو، وہ سپنوں کا شہر

جس کے آنگن میں بہتا ہے نور کا چشمہ اِک اِک پل
جس کی مٹی میں کھلتے ہیں نیل گگن کے حسین کنول
اور جہاں پگھلے پتھر سے بن جاتے ہیں شیش محل

اس دنیا سے دور ہے یارو، وہ سپنوں کا شہر

جہاں نہ کوئی دن ہے ایسا جہاں نہ ایسی رات
جہاں نہ کوئی ایسا عالم جہاں نہ یہ حالات
رِستے زخم کو پھول کہیں اور آنسو کو برسات

اس دنیا سے دور ہے یارو، وہ سپنوں کا شہر

جہاں دہکتا سورج دھوئے خود شبنم کے پاؤں
آشاؤں کے دیپ جلائے جہاں گھنیری چھاؤں
چاند کے گہوارے میں جھولے جہاں کا اِک اِک گاؤں

اس دنیا سے دور ہے یارو، وہ سپنوں کا شہر

جہاں سمندر میرے پیاسی دھرتی کو للکارے
جہاں خوشی کی پائل باجے چندا دوارے دوارے
جہاں سہاگن کی پلکوں سے شرما جائیں تارے

اس دنیا سے دور ہے یارو، وہ سپنوں کا شہر

جہاں نہیں انیائے کی اگنی، جہاں نہیں ہے قہر
جہاں نہیں بہتی ہے یارو کہیں لہو کی نہر
جہاں نہیں گھاتوں کی خراشیں، جہاں نہیں ہے زہر

اس دنیا سے دور ہے یارو، وہ سپنوں کا شہر

ٹ: اس نظم کے بعض بند میں جذباتی لہروں کی مناسبت سے ردوبدل کیا گیا ہے۔

☆☆☆☆

● بھیگی خوشبو

میرے ہونٹ کے پیاسے بادل ساگر ساگر برسیں گے
اَن دیکھی ہر ایک دشائیں جسم کے اندر برسیں گے
بوندوں کی انگلی کو تھامے شہر میں گھر گھر برسیں گے
یہ کہنا مشکل ہے مجھ سے کب یہ کیوں کر برسیں گے

میں تو ازل سے شیش محل کے خوابوں کا رکھوالا ہوں
مجھ میں اک گنگا بہتی ہے آوازوں کا نوالا ہوں
خوشبو کے آکاش سے پوچھو میں کانٹوں کا پالا ہوں
میری جانب چاروں اُور سے پگ پگ پتھر برسیں گے

رستہ رستہ وہی جھمیلے، وہی اندھیرے کی دیوار
لاشیں بازاروں میں سجی ہیں، خوابوں کے بیوپار
میں نے غلط سوچا تھا ابتک، اُجلا ہے جسموں کا پیار
اور سلگتے بوسے ان کے لب کو چھو کر برسیں گے

بانجھ اُمنگوں کے سینے پر کہرے نے رکھا ہے ہات
سانسوں کے بھیگے آنگن میں دھواں دھواں تھی ساری رات
پورب سے لے آئی پروا کچّی خوشی کی سوغات
بن برسے بادل کے قطرے شاید سر پر برسیں گے

مجھ کو میری ذات کے خول سے ہرگز باہر مت کھینچو
میرے اندر کے بھیدوں کے باغی کو چُپ رہنے دو
تم کو کیا احساس ہے اس کا، بھیتر کو تم کیا جانو
کُھل کر جب میں کچھ بولوں گا، مجھ پر پتھر برسیں گے

☆☆☆☆

اونگھتے مکاں سے لوگ

اونچی اڑان رکھتے ہیں ناپائیدار لوگ
باہر مکان سے ہیں بہت دوریار لوگ
مجھ سے ہی جانے ملتے ہیں کیوں کم عیار لوگ
سانپوں کا روپ دھار چکے بے شمار لوگ

سوداگرانِ وقت کے تیور عجیب ہیں
جو کُھل کے آئے سامنے منظر عجیب ہیں
اُڑنے لگے ہوا میں جو پتھر عجیب ہیں
منصب پہ اپنے بیٹھے ہیں بااقتدار لوگ

پتوں کا جسم لمس کی لذت کا ہے اسیر
عالم اگر یہی ہے تو کیا فکر دار و گیر
پتھر کو چیر کر کوئی لائے گا جوئے شیر
خوش فہمیوں کی زد میں ہیں کیا بے قرار لوگ

ہر سُو کھلی فضا ہے ، کُھلا آسمان ہے
ہر چھت کے نیچے اُونگھتا خالی مکان ہے
دیوار و در ہیں اس کے نہ کچھ سائبان ہے
کیوں باندھتے چاروں طرف اک حصار لوگ

چہروں کے آئینہ پہ جو دُھندلا غبار ہے
کب اس سے سوزِ دردِ نہاں آشکار ہے
آنسو زبانِ درد، خموشی پُکار ہے
اندر سے کس قدر ہیں دکھی، غم گُسار لوگ

چُن لو انہیں کہیں یہ خلاؤں میں کھو نہ جائیں
تخمِ الم زمین کے سینے میں بو نہ جائیں
ٹھنڈی ہوا کی نرم سی باہوں میں سو نہ جائیں
کتنا بکھر چکے ہیں سرِ رہ گذار لوگ

☆☆☆☆

آئینہ بدست

نئی رُتوں کے بھید

سُلگتی چھاؤں میں جب بھی رواں ہوئے ہم لوگ
لہو کی دھوپ کو پیکر جواں ہوئے ہم لوگ
جہاں مٹائے گئے جاوداں ہوئے ہم لوگ
زبان جو کاٹی گئی خوش بیاں ہوئے ہم لوگ

وہی چمن جسے شعلوں کی گود نے پالا
بھری بہار میں شبنم نے جس کو ڈس ڈالا
سنا ہے باولا موسم تھا جس کا رکھوالا
اسی چمن کے مگر پاسباں ہوئے ہم لوگ

سرابِ وقت نے دی ہے سزائے تشنہ لبی
بھڑک کے اٹھے ہیں کتنے شرارِ بولہبی
مگر بگوگونجی ہماری فغانِ نیم شبی
طلوعِ صبح ازل کی اذاں ہوئے ہم لوگ

نئی رتوں کے حسین بھید بھاؤ کیا جانو
کلی کلی کی گرہ ہم نے کھولی ہے مانو
ہمارے سنگ ذرا دیکھو ہم کو پہچانو
غبار بن کے اٹھے کہکشاں ہوئے ہم لوگ

فصیلِ شب سے بھی آگے چراغ ہم نے جلائے
کہ بجھتی آنکھ کو کتنے کرشمے ہم نے دکھائے
عجیب بات ہے بھولے سے ہم ہی یاد نہ آئے
سراپا دردِ دل دوستاں ہوئے ہم لوگ

☆☆☆☆

لہو کی موت

گلے میں باندھ کے یوم النشور نکلا ہے
ستم رسیدۂ جامِ صبورنکلا ہے
بتارہے ہیں یہ آثار دور نکلا ہے
وہ بچ بچاکے سفر پر ضرور نکلا ہے

لہوکی قبرمیں سوتارہاہے برسوں سے
برہنہ ہوکے جو روتا رہاہے برسوں سے
خوداپنے آپ کو کھوتا رہاہے برسوں سے
سُراغ اپنا وہ پانے کو دُو ر نکلا ہے

وہ پیڑ جس کے بدن کو رُتوں نے چاٹ لیا
پگھلتی رات کی خاموشیوں سے گھبرایا
یہ شہرشہر اُسی کا تو عام ہے چرچا
عجب ہی کیاجوبڑا باشعور نکلا ہے

یہ اتفاق نہیں ہے لگن کا ثمرا ہے
مری نگاہ تجسس نے جس کو دیکھا ہے
کھدائی دل کی ہوئی اور عجب تماشا ہے
کہ بے طلب کسی موسیٰ کا طور نکلا ہے

ہوا کے پاؤں میں خوشبو کے باندھ کر گھنگرو
تجلیوں کی براتیں لئے کوئی ہرسو
مجھی سے مانگ رہا ہے قدم قدم پہ لہو
مگر وہ اپنے ہی زخموں سے چور نکلا ہے

عجب ہے دور، ہنر سیکھ کر ہوئے بدنام
ستارا ٹوٹ کے پلکوں پہ رُک گیا سرِ شام
ہمارے طرزِ سخن سے کھنچے کھنچے ہیں عوام
گلہ ہی کیا ہے جو اپنا قصور نکلا ہے

☆☆☆☆

ہمت کا لہو

دب گئیں ہیں مرے انا مرے جذبوں کی لَویں
مر گئی ہیں مرے ہونٹوں پہ ہی لفظوں کی لَویں
بجھ گئی ہیں مری تقدیر کے ہاتھوں کی لَویں
کیسے ہاتھوں کی لکیروں کو میں بیدار کروں

ہر طرف ظلم کی باہوں نے ہے گھیرا مجھ کو
ہر قدم پر یہاں ڈستا ہے اندھیرا مجھ کو
راس آیا نہیں جب درد ہی میرا مجھ کو
کس طرح تیز میں احساس کی رفتار کروں

اک نہ اک روز مرا دکھ بھی پرے جائے گا
وقت کاندھے پہ مجھے جب کہ لئے جائے گا
میرا خوں مجھ سے ہی آہستہ کہے جائے گا
کس طرح تیری تباہی کا میں دیدار کروں

میری ہمت کا لہو سرد ہوا جاتا ہے
میرے چہرے کا اُفق زرد ہوا جاتا ہے
اور احساس بھی نامرد ہوا جاتا ہے
سرحدِ ضبط کو ہر بار کہاں پار کروں

کتنی صدیوں کو نیا نور دیا ہے میں نے
نئے اظہار کو مشہور کیا ہے میں نے
دیکھنا جو بھی تھا وہ دیکھ لیا ہے میں نے
اور کس دن کے لئے خود کو میں تیار کروں

☆☆☆☆

آنسو کی لکیر

ہوں پیکر خطا مری تصویر دیکھ لو
قسمت کو کھا گئی مری تدبیر دیکھ لو
آخر شکست خواب کی تعبیر دیکھ لو
خود زندگی ہے لائق تعزیر دیکھ لو

میں ہوں کھلی کتاب مجھے کوئی غم نہیں
ابلاغ کا ہے عجز تو ہرگز الم نہیں
خود آج مجھ کو دیکھنے والوں میں دم نہیں
فتراک دیکھ لو، کبھی نخچیر دیکھ لو

آنسو سے میں نے کھینچی ہے کاغذ پہ اک لکیر
جس میں مرا تصور آفاق ہے اسیر
دیکھو تو خونچکانی خامہ ہے دل پذیر
کس زاویہ سے اُبھرے گی تصویر دیکھ لو

رکھنے کو اب دعا کا بھرم راستا نہیں
اس انجمن میں کون ہے جو دل جلا نہیں
وہ دل ہی کیا ہے جس میں کوئی مدعا نہیں
اظہارِ دردِ دل کرو، تاثیر دیکھ لو

ہر چیز اب ہے قوتِ تخلیق کی دلیل
ہر ذرہ اپنے آپ کا ہوتا نہیں کفیل
پرتوِ آفتاب کی ہستی ہے بے عدیل
صناعِ کائنات کی تعمیر دیکھ لو

میری نگارشات میں اک بانکپن سہی
میرے لہو کے رنگ سے رنگِ چمن سہی
ہر لفظ میرا باعث دادِ سخن سہی
آگے ہے میری شومئ تقدیر دیکھ لو

☆☆☆☆

● ننگے الفاظ

مجھے اس دور کا آذر سمجھ لو
نئے احساس کا پتھر سمجھ لو
حریف آگہی خود سر سمجھ لو
میں جو کچھ ہوں وہی بہتر سمجھ لو

میں زخموں کو کبھی کہتا نہیں پھول
مرا ذوقِ تمنا بھی ہے مجہول
مرے چہرے پہ ہے افکار کی دھول
میں جو کچھ ہوں وہی بہتر سمجھ لو

نوائے تلخ کا مارا ہوں اب تک
غم واندوہ کا دھارا ہوں اب تک
ہجومِ درد کا پیارا ہوں اب تک
میں جو کچھ ہوں وہی بہتر سمجھ لو

گرہ ناخن سے دل کی کیا کُھلے گی
رہوں چُپ تو خموشی کچھ کہے گی
سسکتی رات جانے کیا سنے گی
میں جو کچھ ہوں وہی بہتر سمجھ لو

میں طرحِ نو کا پیغمبر ہوں یارو
ہجومِ یاس کا دفتر ہوں یارو
میں اب تک زندہ پھر کیونکر ہوں یارو
میں جو کچھ ہوں وہی بہتر سمجھ لو

میں ہوں پیکر تراشِ غمزۂ غم
مرے اندر چھپا ہے ایک عالم
کہیں واضح کہیں اب بھی ہوں مبہم
میں جو کچھ ہوں وہی بہتر سمجھ لو

☆☆☆☆

انا کا آئینہ

پھولوں کی طرح چاک مرا پیرہن سہی
سرگشتۂ فراق، غریب الوطن سہی
رسوائے دہر کشتۂ رنج و محن سہی
ملبوسِ کائنات ہوں ننگ بدن سہی

میری انا کا آئینہ ، آئینۂ حیات
سچ پوچھئے تو مجھ سے ہی باقی ہے کائنات
میں چل پڑوں تو صبح کے جلوے، رُکوں تو رات
لاکھ آفتاب بام پہ جلوہ فگن سہی

کوئی فضا ہو میری ضرورت ہے دوستو
میرا وجود زندہ حقیقت ہے دوستو
مجھ سے نشاط مجھ سے ہی زینت ہے دوستو
خلوت کی خامشی سخنِ انجمن سہی

ہر نغمہ میری جنبشِ لب کی نمود ہے
میں جب نہیں رہوں گا زباں ہے نہ سود ہے
میرا مشاہدہ ہی تو شرطِ شہود ہے
عرفان ہست وبود کا کوئی چلن سہی

ہر جام میں ہوں پھر بھی مئے ناکشیدہ ہوں
خود ظلمت بسیط ہوں کب شب گزیدہ ہوں
خود جلوۂ ابد بھی ہوں، خود نوردیدہ ہوں
رنگ تضادِ زیست چمن در چمن سہی

☆☆☆☆

● اَن مِٹ رشتہ

ان گنت رنگوں میں ڈوبا ہوا اک نغمہ ہوں
نت نئے روپ میں جلوؤں سے بھرا چہرہ ہوں
جو کبھی مٹ نہ سکے گا میں وہی رشتہ ہوں
آنے والی نئی صدیوں کے لئے آیا ہوں

اپنے اندر لئے نادیدہ توانا احساس
حدِ آفاق سے آگے کبھی دھرتی کے ہوں پاس
رستخیزی مری افتادِ طبیعت کی اساس
میں افق تا بہ افق دل کی طرح پھیلا ہوں

جو رگِ گل سے ٹپک جائے لہو حیرت کیا
مجھ سے بڑھ کر ہے شناسائے دلِ فطرت کیا
میں ہوں آگاہ کہ کونین کی ہے غایت کیا
خود ہی پنہاں ہوں کہیں اور کہیں افشا ہوں

سر بہ سجدہ ہے مرے سامنے لمحات کی فوج
عرش کو چُھو کے گزر جاتا ہے آگے مرا اوج
بے کراں بحرِ حقیقت ہوں نظر آتا ہوں موج
میں تو مٹ مٹ کے کئی روپ لئے اُبھرا ہوں

میں کبھی صیدِ زماں ہوں نہ مکاں میں محبوس
صبحِ تخلیق برہنہ تھی مگر میں ملبوس
سحر و شام کو کب میں نے کیا ہے مایوس
روشنی شام کی ہوں صبح کا میں جلوا ہوں

☆☆☆☆

جلوۂ گناہ

ٹھہرے ہوئے بسیط سمندر سفر میں تھے
محو سفر صدف تھے تو گوہر سفر میں تھے
بھیگی فضائیں اونگھتے منظر سفر میں تھے
اور ان کے ساتھ ہم بھی برابر سفر میں تھے

جس دم لہولہان سکوتِ حیات تھا
بے برگ و بار یہ شجر کائنات تھا
ہر سو گرفت سنگ میں خوابوں کا ہات تھا
احساس کی دشاؤں میں پتھر سفر میں تھا

یہ باغ وراغ ، لالہ وگل اور مہرو ماہ
دیروحرم ، یہ طور، یہ معبد، یہ سجدہ گاہ
یہ طمطراق و تمکنتِ جلوۂ گناہ
میں چپ کھڑا تھا سب مرے اندر سفر میں تھے

میں جس جگہ بھی بیٹھ گیا میکدا ہوا
کی جس پہ اِک نگاہ دُرِ بے بہا ہوا
پتھر بھی میرے لمس سے آخر خدا ہوا
ساقی، سُبو، صراحی وساغر سفر میں تھے

مٹی نے مجھ سے پائی تھی اک لذت نُمو
صدیوں کو گویا میری ہمیشہ تھی جستجو
میرے لئے تھی صبح کو شبنم بھی باوضو
اور مجھ کو پانے کتنے مقدر سفر میں تھے
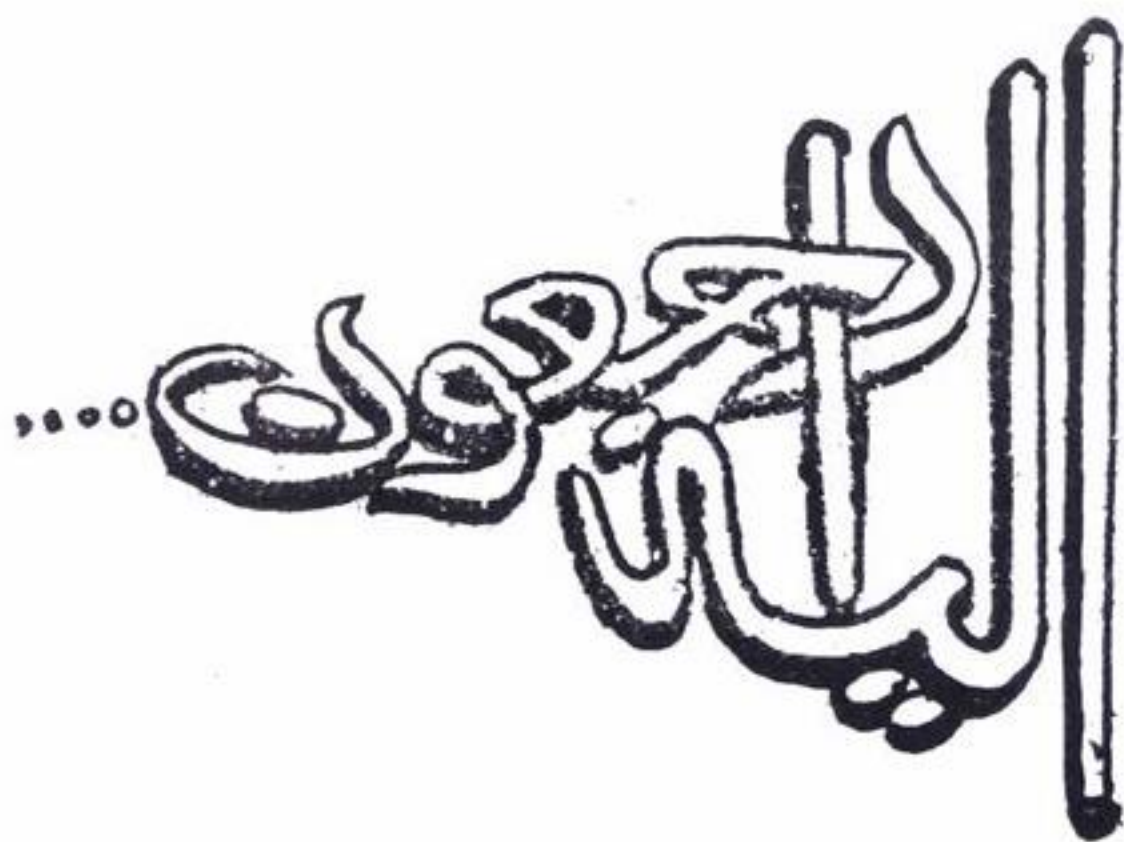
☆☆☆☆

آفاقیت کا نور

پھیلاؤ جب سے پیدا ہوا ہے نگاہ میں
اَن دیکھا کوئی راز کھلا ہے نگاہ میں
جب سے نصیب جاگ اٹھا ہے نگاہ میں
لکھتے بہت تھے اور صؔبا بولتے تھے کم

اپنی نظر میں پنہاں تھا آفاقیت کا نور
سب سے الگ تھلگ تھا ہر اک بات کا شعور
ہم سا ادب میں کوئی نہیں تھا کہ دور دور
ہر زاویہ سے سب سے الگ ہی رہے تھے ہم

ہنستی خزاں کا جلتی بہاروں کا واقعہ
ہر شب کے لب پہ رینگتا تاریک حادثہ
او ر صبح آخرت کی تباہی کا سانحہ
لکھتا رہا ہے آنکھ سے ادراک کا قلم

جب کررہے تھے نت نئے کونین کا سفر
اپنی جسارتوں کی جواں بخت تھی نظر
ذہنی بلندیوں کو ہماری بھی دیکھکر
سات آسمان ہوگئے تھے یوں ہی ہم میں ضم

ان انگلیوں کو کاٹ کے پچھتاؤ گے کبھی
جن سے ورق ورق پہ نمایاں ہے روشنی
جن سے فضائے فکر میں چھوٹی ہے پھلجھڑی
پوشیدہ انگلیوں میں ہے ہردور کا بھرم

☆☆☆☆

تقاضوں کا سفر

اب بھی بے سمت سی راہوں پہ ہے خوابوں کا سفر
دھند میں ڈوب گیا نت نئے چہروں کا سفر
جام تک اب بھی پہنچ پایا نہ ہونٹوں کا سفر
لے گیا مجھ کو بہت دور تقاضوں کا سفر

اپنے اندر کے سفر میں ہے بڑی دشواری
رہروِ ذات کی راہوں پہ ہے نشہ طاری
کام آتی نہیں خارج کی مرصّع کاری
گرد ہی گرد ہے صحراؤں کی گلیوں کا سفر

خود پریشاں ہے آندھی سے نگہدارِ چمن
کبھی کھُلتے نہیں ہر ایک پہ اسرارِ چمن
خواہشیں کتنی ہیں بے دار سردارِ چمن
طے ہو کس طرح مہکتے ہوئے پھولوں کو سفر

اُنگلیاں خون میں ڈوبی ہیں لکھوں گا کیسے
لب پہ صدیوں سے ہی چھالے ہیں کہوں گا کیسے
رستہ رستہ ابھی کانٹے ہیں چلوں گا کیسے
میں تو رک جاتا ہوں، جاری ہے اُمنگوں کا سفر

تم تو دو گام ہی چلتے ہو ٹھہر جاتے ہو
مجھ سے پہلے ہی خلاؤں میں بکھر جاتے ہو
مجھ کو کیا اس سے غرض ہے کہ کدھر جاتے ہو
طے کیا میں نے اکیلے ہی خیالوں کا سفر

☆☆☆☆

کسے موت کہتے ہیں؟

یہ پچھلے پہر کے پُراسرار نغمے
افق تا افق کانپتے نرم سائے
یہ سب کیا ہیں پوچھیں کسے کون سمجھے
نہ تم جانتے ہو نہ میں جانتا ہوں

سنا ہے کہ اس پردۂ رنگ و بو میں
تمہارے نفس میں، مری آرزو میں
کوئی جلوہ گر ہے، شفق میں، لہو میں
نہ تم جانتے ہو نہ میں جانتا ہوں

وہ اِک لمحہ جس کو کہیں حاصلِ غم
وہ جلوہ جو ہے شمعِ طاقِ دوعالم
جو بھڑکے تو شعلہ ہے ڈھلکے تو شبنم
نہ تم جانتے ہو نہ میں جانتا ہوں

دلوں میں یہ جذبِ تگ و تاز کیوں ہے
گھٹاؤں میں یہ ذوقِ پرواز کیوں ہے
یہ عالم سراپردۂ راز کیوں ہے
نہ تم جانتے ہو نہ میں جانتاہوں

کسے موت کہتے ہیں اورزندگی کیا
ازل اور ابد کی یہ افتادگی کیا
الم کس کو کہتے ہیں یہ سرخوشی کیا
نہ تم جانتے ہو نہ میں جانتاہوں

خبر کوئی آتی نہیں آسماں سے
ستارے بھی کہتے نہیں کچھ زباں سے
کہاں ہم کو جاناہے، آئے کہاں سے
نہ تم جانتے ہو نہ میں جانتاہوں

☆☆☆☆

● ایسا کون تھا

کچھ خبر ہے باعثِ تخلیق دنیا کون تھا
پہلے داخل ہونے والا غم کا مارا کون تھا
پیکرِ خاکِ زوال آمادہ کس کا کون تھا
جس کے آگے جھک گئے جبرئیل ایسا کون تھا

کس پہ اُتری پہلے پہلے آیتِ ذوقِ جمال
زخم سے پہلے کہاں پیدا شعورِ اندمال
کس کو پھر پہلے ہوا احساسِ اندوہ مآل
کس نے پہلے زخم کھایا وہ جیالا کون تھا

دیکھکر جس کو ہوئیں اونچی ستاروں کی لوَیں
جی یہ چاہا دیکھکر جس کو کہ افسانہ لکھیں
اور دلِ ناکام کی روداد پلکوں سے کہیں
اجنبی سا شخص وہ اپنا شناسا کون تھا

گرم تھے شب کو بہت ہنگامہ ہائے ناؤ ونوش
اٹھ رہی تھی جام ٹکرانے سے آوازِ سروش
لمحۂ گزراں تھا اُس عالم میں بس جنت بدوش
صبح کو اُس رات کے پہلو سے جاگا کون تھا

میں کہ جب حالات کا پابستۂ زنجیر تھا
دل تھا رہنِ یاس، میں سرگشتۂ تقدیر تھا
فرطِ غم سے میرا چہرہ پیکرِ تصویر تھا
ہر قدم پر وہ دلاسا دینے والا کون تھا

☆☆☆☆

● آگ کا سفر

پھیل کر پھر سمٹ رہی ہے زمیں
روپ نقطے کا دھار لے نہ کہیں
برف کا شہر اتنی دور نہیں
آگ کی اُنگلیوں کو تھام کے چل

فکر کر کچھ بدلتے موسم کا
لاکھ برسے گھٹا تو کیا ہوگا
دل ہو صد چاک، لب رہے پیاسا
آگ کی اُنگلیوں کو تھام کے چل

میں ترا بھید بھاؤ کیا جانوں
میں ہوں قطرہ، تلاؤ کیا جانوں
زندگی کے سبھاؤ کیا جانوں،
آگ کی اُنگلیوں کو تھام کے چل

ڈسنے لگتی ہے جب بھی تنہائی
کچھ تو کہتی ہے ٹھنڈی پُروائی
شبنمی صبح کے اے شیدائی
آگ کی اُنگلیوں کو تھام کے چل

صحرا صحرا سفر کا رشتہ ہے
جلوہ جلوہ نظر کا رشتہ ہے
قطرہ قطرہ گہر کا رشتہ ہے
آگ کی اُنگلیوں کو تھام کے چل

آنکھ رونے لگی ہے پتھر کی
آگے تصویر ہے مقدر کی
جستجو ہے اگر سمندر کی
آگ کی اُنگلیوں کو تھام کے چل

ا : تلاؤ بمعنی تلاب

☆☆☆☆

● لکیروں کی سرگوشی

مہکتی ، دہکتی ہوئی شام لکھ
چھلکتا ہوا زرنشاں جام لکھ
افق تابِ داغِ نا کام لکھ
مقدر میں میرے بھی آرام لکھ

حرم، دیر، میخانہ و خانقاہ
کہیں بھی میسر نہیں ہے پناہ
وہی تلخیِ غم، وہی سوزِ آہ
مقدر میں میرے بھی آرام لکھ

پگھلتا ہوا خواب زرکار دے
جو دیتا غم، غم کا معیار دے
دل زندہ اور ذہن بیدار دے
مقدر میں میرے بھی آرام لکھ

ہر ایک شخص خانوں میں جب بٹ گیا
دلوں کا جو رشتہ تھا وہ کٹ گیا
قدم اپنے مرکز سے بھی ہٹ گیا
مقدر میں میرے بھی آرام لکھ

ہے صبح چمن شب گزیدہ ابھی
تبسم بھی ہے نارسیدہ ابھی
ہراِک پھول ہے خوں چکیدہ ابھی
مقدر میں میرے بھی آرام لکھ

☆☆☆☆

● پیاسی تمنّا

اُلجھا ہوا ہے کاکلِ ہستی سنوار دے
زحمت یہ ایک بار نہیں بار بار دے
ہے ذہن منجمد سا اسے کچھ شرار دے
میرے لہو میں لمس کا سورج اتار دے

جلووں کی آنچ یاس سے یخ بستہ ہو نہ جائے
کہرے کی انگلیوں سے کوئی شمع کیا جلائے
بن برسے بادلوں کے تلے کوئی کیا نہائے
بارش اگر تو دے نہیں سکتا پھوار دے

اُترا ہے ہر درخت سے پتوں کا پیرہن
دبتا چلا ہے درد کے لمبے تلے چمن
دل میں اگر خلوص ہے سچی ہے ہر لگن
ہنگامۂ خزاں میں پیامِ بہار دے

اِک طرفہ طرزِ زیست ہے بارِ گرانِ ہوش
نیرنگیٔ حیات میں ہے حوصلوں کا جوش
پیدا ہو کوئی رنگِ تغیر، نیا خروش
بازی جو جیت لی ہے کسی طرح ہار دے

آنکھوں میں اشک، قلب پریشان ہی سہی
آخر گرفتِ سنگ میں ارمان ہی سہی
سامانِ خوردونوش کا فقدان ہی سہی
بھوکے ہیں لوگ پیار کے للہ پیار دے

سنتا ہوں شب گزیدہ ہے ہر جلوۂ سحر
ذرے کی ہر گرفت میں تابانیٔ گہر
اور زندگی کے بوجھ سے جھکنے لگا ہے سر
میں دو قدم بھی چل نہیں سکتا اُتار دے

☆☆☆☆

تجھ سے پوشیدہ نہیں کچھ بھی مرے اے معبود
نفی و اثبات کے برزخ سے ہے ہستی کی نمود
میں ہوں زندانیٔ آفاق تُو ہے لا محدود
تجھ سے وابستہ مرا ذوقِ نظر، میرے سجود

"لا" کے تپتے ہوئے صحرا میں تجھے ڈھونڈا ہے
دیر و کعبہ میں کلیسا میں تجھے ڈھونڈا ہے
میں وہ قطرہ ہوں کہ دریا میں تجھے ڈھونڈا ہے
تُو بہر جامۂ بے برگ و نوا ہے موجود

ذات ہے سرحدِ ادراک سے آگے تیری
کہ جہاں تک نہیں ممکن ہے رسائی میری
میں نے ہر راہ کی صدیوں سے لگائی پھیری
میرا ہر ذوقِ تجسس ہے ابھی تک بے سود

تیری پہچان کے آفاق پہ رنگوں کی پھوار
نگہتِ گل ، رمِ نغمہ، خلشِ ناوک و خار
زاویے روپ کے اتنے ہیں نہیں جن کا شمار
ہے تُو ہی رنگِ شفق ، جلوۂ مہ، چرخِ کبود

ذات ناقابل تقسیم ،اکائی تیری
خواجگی تیری،چشم تیرا، گدائی تیری
ذرّے ذرّے میں ہے وہ جلوہ نمائی تیری
تو ہی شاہد تو ہی مشہود تو ہی عینِ شہود

☆☆☆☆

"لمسِ اوّل"

(اردو ادب میں جدید ٹیپ بند نظموں کا پہلا مجموعہ)

- "لمسِ اوّل" اُن نام نہاد جدید فن کاروں کے منہ ایک بھرپور طمانچہ ہے کہ پابندی شاعری میں جدید نقطۂ نظر سے ندرت اور تنوع پیدا کرنا مشکل ہے۔ "لمسِ اوّل" دراصل زندۂ جاوید شاعری کی بھرپور علامت ہے۔ **دانش فرازی آمبور**
- جدید جمالیات کا عنصر علیم صبا نویدی سے بہتر کوئی کھینچ نہ سکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ عطر ایک ابدی مہک اور ایک نئی صبح ازل کا پیش رفت ثابت ہوگا۔ **مولانا اسمٰعیل رفعی، عمر آباد**
- علیم کی شاعری زخموں کی شاعری ہے: ایک ایسے انسان کے سفر کی داستان ہے جو اپنے زخموں کی روشنی میں سماج کے گھناؤنے راستوں سے گزر رہا ہے اور ایک بلند اور اعلیٰ آدرش کی تلاش میں ہے۔ **راز امتیاز۔ بنگلور**
- "لمسِ اوّل" کی ہر نظم ایک دیرپا تاثر چھوڑتی ہے۔ **پروفیسر حمر سہروردی، ترچنا پلی**

میر تقی میر نشتریت سے پہچانے جاتے ہیں وہی نشتریت مجھے "لمسِ اوّل" کی اکثر نظموں میں ملتی ہے۔ **حسن فیاض، مدراس**

- "لمسِ اوّل" میں علیم صبا نویدی نے علائم میں جدت کے ساتھ ساتھ الفاظ کے انتخاب میں بڑی خوش سلیقگی سے کام لیا ہے۔

حکیم مجیب اسلم، وانمباڑی

- "لمسِ اوّل" ٹیپ بند نظمیں جدید شعری ادب میں ایک ایسا موڑ ہیں جہاں سے بیشمار روشنی کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ **اعجاز شاکری**
- "لمسِ اوّل" کی نظمیں حال کے کرب کی آئینہ دار اور ذات کے غم کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ **محسن بھوپالی، کراچی**
- "لمسِ اوّل" اردو ادب میں یقیناً ایک جدید کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے۔ **عادل عثمانی، کراچی**
- "لمسِ اوّل" کی فکر انگیز اور بیحد معیاری و منفرد نظمیں واقعی داد کی مستحق ہیں۔ **کلیم نشتر، لاہور**
- "لمسِ اوّل" میں علیم صبا نویدی نے نظم کے قدیم بیانیہ اصناف کو نئے احساس و آگہی کے خوشگوار علامتی تجربات کے ساتھ برتنے کی کوشش کی ہے جو واقعی لائقِ قدر ہے۔ **ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، دہلی**
- "لمسِ اوّل" علیم صبا نویدی کی مشاقی اور زبان پر قدرت کی روشن دلیل ہے۔ **شمس الرحمن فاروقی، دہلی**
- "لمسِ اوّل" علیم صبا نویدی کی فنی پختگی، تخلیقی جوہر اور شاعرانہ صلاحیتوں کا دلکش مظہر ہے۔ **ڈاکٹر مظفر حنفی، دہلی**
- "لمسِ اوّل" کی نظموں سے علیم صبا نویدی کی جولانی اور خلاقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ **ڈاکٹر عنوان چشتی، دہلی**
- "لمسِ اوّل" کی نظموں میں اسالیب کا جو تنوع ملتا ہے وہ نفسِ مضمون سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ **ڈاکٹر شمیم حنفی، دہلی**
- جدیدیت کے نام پر بے تکی، بے وزن نظمیں لکھے جانے کے دور میں علیم صبا نویدی کی مقفّیٰ و مسجع نظمیں روشنی کی نئی کرن کی طرح ہیں۔

اظہار اثر، دہلی

- "لمسِ اوّل" کی نظموں سے علیم صبا نویدی کی مشاقیٔ سخن، احساسِ دوراں اور حسنِ بیاں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ **حسن تحیم، دہلی**
- اس دور میں "لمسِ اوّل" کی پابند نظموں کی تخلیق وہ بھی مصرعۂ ترجیع کے اہتمام کے ساتھ بڑا فنی کارنامہ ہے **کوثر چاند پوری، دہلی**
- "لمسِ اوّل" علیم صبا نویدی کے قدرتِ کلام اور فن کی پختگی کی روشن دلیل ہے۔ **کرشن موہن، دہلی**
- اردو تخلیقی ادب میں "لمسِ اوّل" کا کارنامہ بے شک ایک افسانہ ہے۔ **ضیا فتح آبادی، دہلی**
- "لمسِ اوّل" علیم صبا نویدی کے دل کی گہرائیوں اور تخیل کی اونچی اڑان کا ثبوت ہے۔ **نارائن پرکاش بخشی، دہلی**
- "لمسِ اوّل" کی نظموں میں تغزل کی چاشنی کو برقرار رکھتے ہوئے علیم صبا نویدی نے واقعی ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ **کیور سین، دہلی**

- ''لمسِ اوّل'' یقیناً اردو ادب میں ایک انمول شہ پارہ ہے۔ **ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری**
- ''لمسِ اوّل'' ہیت کے اعتبار سے بڑی خاصے کی چیز ہے۔ **ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، دہلی**
- علیم صبانویدی کے کلام میں اہتمام نظم و ضبط کی دلآویزی سے میں متاثر ہوا ہوں۔ **نلراج کومل، دہلی**
- ''لمسِ اوّل'' ہمارے اردو شاعری کے مستقبل کیلئے ایک نیک فال ہے۔ **پروفیسر جگن ناتھ آزاد، کشمیر**
- ''لمسِ اوّل'' میں علیم صبانویدی نے ایک فراموش شدہ کلاسکی ہیت کو نئے معانی کے ساتھ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر وحید اختر، علیگڈھ

- ''لمسِ اوّل'' کی نظموں میں تنوع اور شگفتگی بہت نمایاں ہے۔ **پروفیسر زاھد زیدی، علیگڑھ**
- ''لمسِ اوّل'' میں علیم صبانویدی نے اردو شاعری کے نئے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور زبان و تخیل دونوں کے لحاظ سے شاعری میں وقیع اضافے کئے ہیں۔ **محمد حسین رضوی، علیگڑھ**
- ''لمسِ اوّل'' حقیقت پسندانہ شاعری کے زمرے میں آتی ہے اور دل نشینی کی معراج کو چھوتی ہے۔ **اختر الاسلام، میرٹھ**
- ''لمسِ اوّل'' کی بیشتر نظمیں اسلوب، احساس اور انداز بیان کے اعتبار سے بہت خوبصورت ہیں۔

پروفیسر بمل کرشن اشک، ہریانہ

- ''لمسِ اوّل'' میں جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ علیم صبانویدی کا انداز بیان ہے جو سب سے الگ ہے۔

ڈاکٹر احتشام اختر، راجستھان

- ''لمسِ اوّل'' کی نظمیں قدیم رموز و نکات کے ساتھ نئے رجحانات اور افکار کی بھر پور نمائندگی کرتی ہے۔ **ڈاکٹر فضل امام، جے پور**
- ''لمسِ اوّل'' کی نظمیں میں لب و لہجہ کی شگفتگی بہت خوشگوار اور دل پذیر ہے۔ **نامی انصاری، کانپور**
- ''لمسِ اوّل'' کی نظموں میں آج کے انسان کے درد و دل کی بہترین عکاسی ہے اور طرز بیان میں شگفتگی ہے۔ **علقمہ شبلی، کلکتہ**
- علیم صبانویدی کے کلام کی رعنائی بڑی تابناک ہے۔ **ڈاکٹر نور الحسن ھاشمی، لکھنؤ**
- ''لمسِ اوّل'' میں علیم صبانویدی نے جدید فکر اور کلاسکی انداز کو اپنا کر ترسیل کی ناکامی کا رونا رونے والوں کے منہ پر بھر پور طمانچہ مارا ہے۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی، الہ آباد

- ''لمسِ اوّل'' علامت نگاری کا ایک خوشگوار اور کامیاب تجربہ ہے۔ **ڈاکٹر گیان چند جین، الہ آباد**
- علیم صبانویدی نے خیالات کے اظہار کے لئے ایک قدیم صنف سخن یعنی مربع کو استعمال کیا ہے۔ ان کا یہ تجربہ خاصا کامیاب اور معنی خیز ہے۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر، بھوپال

- ''لمسِ اوّل'' میں لمس کو پیکر دینے میں علیم صبانویدی نے جس مہارت اور فنکارانہ چابکدستی سے کام لیا ہے وہ یقیناً قابل داد ہے۔

اشفاق انجم، مالیگاؤں

- ''لمسِ اوّل'' بلاشبہ اردو شاعری کے نئے امکانات کی بھر پور نشاندھی کرتا ہے۔ **پروفیسر مختار شمیم، اندور**
- ''لمسِ اوّل'' کی نظمیں پڑھکر طبیعت پھڑک گئی، واقعی علیم صبانویدی نے اشعار میں موتی پرو دئے ہیں۔ **علامہ جمیل مظھری، پٹنہ**
- ''لمسِ اوّل'' کی نظموں میں شاعری کی روایتوں کا احترام بھی ہے اور عصری حسن کا اظہار بھی۔ **مولانا سھیل عظیم آبادی، پٹنہ**
- ''لمسِ اوّل'' کی شاعری میں لہجے کا وقار اور موضوع کی سنجیدگی بڑی نمایاں خصوصیات ہیں۔ **پروفیسر علیم الله حالی، گیا**
- ''لمسِ اوّل'' کی نظمیں ہیت کے اعتبار سے کلاسکی ہیں لیکن داخلی اور معنوی حیثیت سے بہت جدید ہیں۔ **ابو یوسف، گیا**
- ''لمسِ اوّل'' کی نظموں میں حیات و جدانیات کی ماورائی کیفیتیں بھی ہیں اور عشق و محبت کی دل گدازی بھی۔

پروفیسر مناظر عاشق ھرگانوی، ھزاری باغ

- ''لمسِ اوّل'' مدراس جیسی سنگلاخ زمین سے پھوٹا ہوا ایک گل ہزار رنگ ہے۔ **روف خیر، حیدر آباد**

علیم صبا نویدی کا

ایک اور کارنامہ ''خاک زاد''

(نعتیہ شاعری میں اضافہ)

☆ ''خاک زاد'' لطیف شعری تجربوں کا مجموعہ ہے جہاں زندگی زندگی پر بھاری ہو وہاں ایسے شعری مجموعے تھام تھام لیتے ہیں۔ یہ طویل نظم جس مختصر ترین تجربوں کے احساسات سے وجود میں آئی ہے وہ تجربے قاری کے احساس اور جذبے کو چھو لیتے ہیں یہ شاعری کی عمدہ فن کاری کی مثال ہے۔۔۔۔

۞ پروفیسر شکیل الرحمن، دہلی

☆ ''خاک زاد'' سے دیدہ و دل روشن ہوئے اس میں بھی آپ کے تخلیقی جوہر جس درخشندگی و تابناکی کے حامل ہیں وہ یقیناً قابلِ داد ہیں۔ ڈاکٹر جاوید حبیب نے بھی ''اپنی بات'' دوٹوک اور صاف صاف کہہ دی ہے۔ بہت خوب ہے۔۔۔

۞ ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، پٹنہ

☆ ''خاک زاد'' سہ مصرعی شاعری میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کرامت علی کرامت کا مضمون آپ کی نعتیہ شاعری پر بھرپور ہے۔ آپ نعتیہ گیت کے بھی موجد ہیں۔ کرامت علی نے کہیں کسی مضمون میں لکھا تھا کہ آپ نے ہی ہائیکو میں بھی سب سے پہلے نعتیں لکھی تھیں۔۔۔

۞ ڈاکٹر فراز حامدی، جے پور

☆ آپ کی قدرتِ کلام کے کیا کہنے۔۔۔ ''خاک زاد'' آپ کا نہایت عالی مرتبت شعری کارنامہ ہے۔۔

۞ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، حیدرآباد

☆ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے پناہ زرخیز اور تخلیقی ذہن سے نوازا ہے یہی وجہ ہے کہ آپ جدید شعری ہیئتوں میں نت نئے کامیاب تجربے کر رہے ہیں اس لحاظ سے جدید اردو شاعری کی مختصر ترین تاریخ آپ کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔۔۔۔

۞ ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی، بھٹکل

☆ ''خاک زاد'' نے ادبی ہمالیہ کی ساری چوٹیاں سر کر لی ہیں۔۔۔۔ علامہ ناوک حمزہ پوری

☆ خوشی کی بات ہے کہ ''خاک زاد'' میں آپ کی تخلیقیت برقرار ہے اور آپ کی خدمات کے اعتراف میں کتابیں بھی شائع ہو رہی ہیں۔۔۔۔۔

۞ پروفیسر نیر مسعود، لکھنو

☆ آپ نے جن اصنافِ ادب پر کام کیا ہے انہیں جاوداں اور غیر فانی کر دیا ہے۔ تاریخِ ادب آپ کے تخلیقی کاموں کو قطعاً فراموش نہیں کر سکے گی اور دیانت دار ناقدین اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔۔۔ ۞ عشرت ظفر، کانپور

☆ طویل نظم ''خاک زاد'' میں فکر انگیز کلام موجود ہے۔ فنِ حدیث میں ایک قسم ایسی ہے جس میں راوی اور نبی کریمؐ کے درمیان سند میں تین حضرات ہوتے ہیں، ایسی کئی احادیث بخاری شریف میں موجود ہیں جن کو ثلاثیات بخاری میں کہا جاتا ہے۔ ''خاک زاد'' کی ثلاثیات میں اس کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔۔۔ ۞ ابوالبیان حماد، عمرآباد

☆ ''خاک زاد'' کی نظمیں بقول کرامت علی باہم مربوط ہیں اس لئے بایں مجموعے کی نظموں کو ثلاثیات یا مثلثات کہنے کی بجائے کمشت فارم کی طویل نعتیہ نظم کہا جا سکتا ہے۔ ''خاک زاد'' آپ کا تخلیقی اور اجتہادی کاوشوں کا اہم اور قابلِ مطالعہ کارنامہ ہے۔۔۔۔۔

۞ اسلم حنیف، بدایون

''اردو نظم کے سلسلے''

(مطبوعہ: ۲۰۰۹ء)

〈اردو نظم کی تاریخی دستاویز〉

☆ اردو نظم کی ابتدائی کاوشوں سے لے کر معاصر نظم نگاروں کی تخلیقات کو آپ نے اپنے انتخاب میں جگہ دی ہے ۔اتنے سارے مواد جمع کرنا اور پھر ان مختلف النوع ہیئتوں اور صنفوں پر اپنی جچی تلی رائے کے ساتھ مرتب کرنا آسان کام نہیں۔ یہ کام آپ ہی کا حصہ ہے اور بلاشبہ آپ کی ذہانت، ادبی وابستگی، محنت اور نظم شناسی لائق ستائش ہے۔ آمین

• پروفیسر حامدی کاشمیری سری نگر

☆ ''اردو نظم کے سلسلے'' اس دور کا اہم کارنامہ ہے، قابل رشک کام ہے۔ جانے آپ کے قبضے میں کتنے جن جنات ہیں جو ایسے بڑے کام میں آپ کی مدد کرتے ہیں۔ بہت مبارک ہو، یہ کام اساتذہ اور اردو کے اسکالرز کے لئے ایک اہم ''ڈکشنری'' کی حیثیت ہے۔ یہ زندہ رہنے والی کتاب ہے۔ نئی نسلیں یقیناً ہمیشہ اس سے مدد لیتی رہیں گی۔

ایسے عمدہ کام کے لئے میں نے ہمیشہ آپ کے حوصلے کی داد دی ہے۔ حوصلہ یقیناً بلند تھا ورنہ ایسا کام ہوتا ہی نہیں۔ دعا گو بابا سائیں۔

• پروفیسر شکیل الرحمن منی دھلی

☆ یہ بات قابلِ رشک ہے کہ آپ اپنی سعی و کوشش اور مسلسل توجہ سے اردو کے ادبی سرمایہ میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اردو کے ہزاروں شاعروں میں سینکڑوں کا انتخاب اور ان کی تخلیقات کی جمع آوری، چھان پھٹک، ترتیب و اشاعت اور پھر تخلیقات پر اپنی آراء پیش کرنے کا کام بڑا تھکا دینے والا ہے۔

کبھی موقع ملے تو اہم ترین اردو مکتوبات کا بھی ایک انتخاب بھی ضرور شائع کر دیں۔ اس طرف لوگوں کی توجہ کم ہے۔ اس طرح کے کام سے اچھے خطوط کا بہت اہم ذخیرہ تباہ ہونے سے بچ جائے گا اور آپ کی کوششوں سے محفوظ ہو جائے گا۔

• پروفیسر مختار الدین احمد، علی گڑھ

☆ میں اب قریب قریب اپاہج ہو گیا ہوں۔ لکھنا بھی ممکن نہیں رہا۔ بس پڑھ لیتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے۔ ایسے میں آپ کی تاریخی دستاویز ''اردو نظم کے سلسلے'' ملا۔ گویا پڑھنے کو بہت کچھ مل گیا۔ اردو نظم کی ایک دنیا سے ملاقات ہو گئی۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

• پروفیسر نیر مسعود لکھنو

☆ ''اردو نظم کے سلسلے'' نظموں کا نہایت عمدہ، قابل قدر انتخاب ہے۔ میری نظر میں یہ اردو شاعری کی لائق مطالعہ تاریخ ہے جو نظم کی صنف کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔ آپ کی کتاب واقعی اس قابل ہے کہ اس سے بھر پور استفادہ کیا جائے۔ سرسری مطالعہ سے بھی یہی خیال ہوتا ہے کہ شاید ہی کوئی قابلِ توجہ شاعر ایسا ہو جس کا نام اور کلام سے یہ کتاب خالی ہو۔ کچھ شبہ نہیں کہ اس کتاب پر آپ نے اور عزیزہ ڈاکٹر جاوید حبیب نے غیر معمولی محنت کی ہے۔ واقعی آپ دونوں نے وہ کام کیا ہے جو کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔

• پروفیسر محمد انصار اللہ، علیگڑھ

☆ آپ کی نہایت مفید اور معلومات انگیز کتاب ''اردو نظم کے سلسلے'' میں نے بڑے شوق سے پڑھی۔ کئی پرانے اور مرحوم ساتھی اپنی نظموں میں سانس لیتے، سوچتے اور محسوس کرتے مل گئے ہیں اور بڑا اچھا لگا ہے۔

• پروفیسر جوگندر پال، دھلی

☆ ''اردو نظم کے سلسلے'' ایک اہم کتاب ہے۔ غزلوں کے انتخاب تو بہت مل جاتے ہیں، مگر نظموں کے انتخابات کی طرف شاذ ہی توجہ دی جاتی ہے۔ نظموں کا اب تک سب سے عمدہ انتخاب، خلیل الرحمٰن اعظمی کا مرتب کردہ ''نئی نظم کا سفر'' ہے۔ لیکن اس میں صرف ۱۹۶۰ء کے بعد کی نظموں کا انتخاب ہے۔ آپ نے حالؔی اور اسمٰعیل میرٹھی سے لے کر اب تک کی نظمیں منتخب کی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ایک عمدہ تاریخ ساز کوشش ہے۔

• مظھر امام، نئی دھلی

☆ اردو نظم کا عالمی انتخاب ''اردو نظم کے سلسلے'' کی عظیم القدر سوغات ملی۔ آپ سمندر کو کوزے میں سمیٹ لینے اور قطروں کو سمندر میں پھیلا دینے کی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ آپ نے اس عظیم کارنامے پر میری حقیر دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

• محبوب راھی، آکولہ

☆ آپ کا تخلیقی دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ صرف رسمی حرف ستائش اس کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا۔ بہر حال آپ کا تازہ ترین تالیفی کارنامے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ''اردو نظم کے سلسلے'' تاریخی اور حوالہ جاتی اہمیت کے حامل ہیں اور اردو نظم کے تعلق سے عام قارئین، طلباء، ناقدین اور نظم سے خصوصی دلچسپی رکھنے والے لوگوں کی طرف سے اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

• بلراج کومل، نئی دھلی

☆ آپ کا اختراعی ذہن کیسے کیسے پروجکٹ سوچتا رہتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے۔ پھر اسے فوراً اپنے آپ عملی جامہ بھی پہنا دیتے ہیں۔ ۵۷۶ صفحات پر مشتمل کتاب ''اردو نظم کے سلسلے'' تاریخ اردو ادب کی بے حد اہم اور جامع کتاب ہے۔ اس سے ہمیشہ استفادہ کیا جائے گا۔ آپ کی فطری صلاحیتوں اور قدرتی ودیعتوں نے اسے دستاویزی بنا دیا ہے۔

• پروفیسر مناظر عاشق ھرگانوی بھاگلپور

☆ ''اردو نظم کے سلسلے'' آپ کی اردو خدمات کا روشن شناخت نامہ ہے۔ آپ کی علمی و ادبی فتوحات و اکتسابات سے دل خوش ہوتا ہے۔ آپ کی بے لوث خدمات کا اعتراف میرے استاد محترم پروفیسر نجم الہدیٰ مدظلہ العالی نے اپنی

تحریروں میں بڑے اچھے انداز میں کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں۔ • پروفیسر ممتاز احمد خان، حاجی پور (بہار)

☆ واللہ! آپ کی گراں قدر اور عظیم الشان کتابوں کا پرشکوہ کارواں تھمتا ہی نہیں۔ منزلوں پر منزلیں مار رہے ہیں پھر بھی تھکن نام کو بھی نہیں۔ کتاب "اردو نظم کے سلسلے" ایک اچھے مصنف اور میرے اچھے دوست کا تحقیقاتی کارنامہ ہے جس نے ایک اور ادبی قلعہ فتح کر لیا ہے۔ • مختار گونگی، راجستھان

☆ نظموں کے موضوعات پر "اردو نظم کے سلسلے" میں شامل سبھی مضامین وقیع اور فکر انگیز ہیں۔ ان کے علاوہ منتخب نظموں کی شمولیت سے کتاب کی افادیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اس طرح اس کے دستاویز کی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً اتنی ساری نظموں کو یکجا کرنے میں آپ کی عرق ریزی قابلِ ستائش ہے۔

• سعیدہ رحمانی، کٹک (اڑیسہ)

☆ کتاب "اردو نظموں کے سلسلے" بہت ہی خوبصورت ہے اس میں مشمول مضامین بھی بصیرت افروز ہیں۔ فی الحال دہلی آ چکا ہوں۔ موقعہ ملے گا تو اس پر تفصیلی طور پر لکھنے کی ضرور کوشش کروں گا۔ • دیپک بدکی، نئی دہلی

☆ "اردو نظم کے سلسلے" کی تیاری میں آپ کی محنت اور عرق ریزی صاف عیاں ہے۔ ایسا بے مثال کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو شعر و ادب سے والہانہ عشق رکھتے ہیں۔ • یوسف عارفی بنگلور

☆ آپ نے بہت کم عمری میں بہت وقیع کام کیا ہے۔ آپ کا نام درخشاں اور تابناک رہے گا۔ ڈاکٹر جاوید حبیب بھی آپ کے ساتھ خوب کام کر رہی ہیں۔ ضخیم کتاب "اردو نظم کے سلسلے" جدید و قدیم نظموں کا بہترین اور انمول انتخاب ہے۔ کتاب دیکھکر آپ سے دیرینہ ملاقاتوں کی خوشبو پھر سے تازہ ہو گئی ہے۔ • عشرت ظفر، کانپور

☆ تحقیقی، تنقیدی اور تالیفی میدان میں آپ کی خدمات ہندوستان بھر میں بڑی انفرادیت کی حامل ہیں۔ جنوبی ہند میں آپ نے ایک حیرت انگیز تاریخ بنائی ہے۔ یہ محض تعریفی کلمات نہیں بلکہ اظہر من الشمس حقیقت کا اظہار ہے۔

"اردو نظم کے سلسلے کے مطالعہ سے اتنا ضرور محسوس ہوا ہے کہ آپ نے اردو پر بہت بڑا کام کیا ہے۔ دہلی یا حیدرآباد کے نام نہاد اردو ماحول میں لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

بنگلور اردو اکاڈمی کے تین روزہ سیمنار میں آپ نے بہت اچھا مشورہ دیا کہ میں "تلگو زبان میں اردو غزل کے رواج" پر سیر حاصل مضمون لکھوں۔ انشاء اللہ میں بہت جلد اس موضوع پر ایک مضمون لکھ کر آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں گا۔ ان دنوں بچی کی شادی کے کاموں میں بے حد مصروف ہوں۔ "تازہ نورِ جنوب" منظر عام پر آ گیا ہے تو فوراً بھیج دیں۔

• ڈاکٹر قطب سرشار، محبوب نگر (آندھرا)

☆ میرے پاس تو الفاظ ہی نہیں کہ میں آپ کی عملی کاوشوں کے لئے تحسین کا حق ادا کروں۔ نظموں پر مشتمل "اردو نظم کے سلسلے" تحقیقی کام کے لئے آپ قابلِ مبارکباد ہیں۔

میں نے میرے دو عدد مجموعے آپ کی خدمت میں ارسال کئے تھے۔ دونوں کی رسید سے محروم ہوں۔ ان دونوں مجموعوں کے تعلق سے آپ کی خدمت بابرکت یہی عرض ہے:

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے شاعر و نقادِ سخن کچھ تو ادھر بھی

• پروفیسر امین اشرف، علی گڑھ

☆ گراں قدر اور حوالہ جاتی کتاب ''اردو نظم کے سلسلے'' کی اشاعت پر ناچیز کا مبارکباد قبول فرمائیے۔ اردو نظم پر تحقیقی و تنقیدی کام کرنے والے حضرات اس کتاب سے بھرپور استفادہ کرتے رہیں گے۔

یقیناً آپ نے اردو ادب میں بہت اچھا اور مفید کام کیا ہے اسے کوئی بھی محقق نظر انداز نہیں کر سکتا۔

• پروفیسر شاھد پٹھان، جے پور (راجستھان)

☆ ''اردو نظم کے سلسلے'' میں آپ نے ان تمام تدریجی تبدیلیوں کو من حیث المجموع پیش کیا ہے جو اس کے ساتھ مختص رہی ہیں اس اعتبار سے آپ کی یہ گرانقدر تاریخی دستاویز اور یادگاری حیثیت کی حامل مستقبل تصنیف بن گئی ہے جس سے آنے والے ہر دور میں صاحبانِ علم و ادب بخوبی استفادہ کرتے اور اپنے ہم عصروں کو مستفیض کرتے رہیں گے۔

• عتیق احمد عتیق، مالیگائوں

☆ آپ ہمیشہ اردو ادب کے شیدائیوں کو چوکا دینے کی کوشش میں مصروف رہے ہیں۔ آپ کی یہی ادا کا میں عاشق ہوں۔ ''اردو نظم کے سلسلے'' میں میرے نظموں کا انتخاب کا شکریہ۔ اردو نظموں کے انتخاب میں بہت سے نئے ناموں سے جان پہچان ہوئی۔ ڈاکٹر جاوید حبیب نے صحیح لکھا ہے کہ یہ انتخاب کسی گروپزم کا شکار نہیں ہے۔ کاش یہ وسیع النظری سب میں آجائے۔

• ڈاکٹر محمد علی اثر حیدر آباد

آپ نے اردو نظم گوئی پر بڑی اچھی اور معلومات افروز کتاب ترتیب دی ہے۔ اردو نظم پر ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے بعد کام کرنے والوں میں آپ کا نام ہمیشہ تاریخِ اردو ادب میں زندہ جاوید رہے گا۔ آپ نے ٹمل ناڈو کے اکثر شعراء کی نظمیں جو آج نایاب ہیں، اس انتخاب میں شامل کر کے ٹمل ناڈو کے نظم گو شعراء کا نام روشن کیا ہے۔ اس کے مطالعہ کے لئے ایک عمر درکار ہے۔ اب تو آنکھیں بھی جواب دے چکی ہیں۔ پتہ نہیں اس کے اشاعت تک میں زندہ رہوں گا بھی یا نہیں

• کاوش بدری، آمبور

(حضرت کاوش بدری نے ''اردو نظم کے سلسلے'' کا مسودہ اپنی موت سے پہلے دیکھا تھا اور ناچیز کی جبین کو تین بار چومتے ہوئے نیک اور صالح دعاؤں سے سرفراز فرمایا تھا۔ حضرت موصوف آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ پھر بھی ان کی دعاؤں کی خوشبو ہمارے ذہن و دل میں روشن اور موثر ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت موصوف کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین)